دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

جلد: ۱۰۱ | ذی قعدہ-محرم ۱۴۳۸ھ مطابق اگست-ستمبر ۲۰۱۷ء | شمارہ: ۸-۹

نگراں

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری

استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند-۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.: 2133/57
Vol. No. 101, Issue No. 8-9, August-Sept. 2017 अगस्त-सितम्बर 2017
Printer Publisher :- Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
Owner :- Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 40/= | Annual Subscription Rs. 200/=

Annual by Regd Post. Rs. 440/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۴۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۷۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۷۰۰ روپے

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو =/440 روانہ فرمائیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

اٹھتے جاتے ہیں اب اس بزم سے اربابِ نظر

محمد سلمان بجنوری

حسب وعدہ، حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نوراللہ مرقدہ کے تذکرہ پر مشتمل، دو ماہ کا مشترکہ شمارہ پیش خدمت ہے، جس میں ممتاز علماء واہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔ ہمارا ابتدائی اندازہ تھا کہ تقریباً ساٹھ ستر صفحات، حضرت مولاناؒ سے متعلق مضامین کے ہوجائیں گے؛ لیکن جب مضامین موصول ہوئے تو محسوس ہوا کہ اگر سارے مضامین دیے جائیں تو تقریباً دوسو صفحات ہوجائیں گے۔ پھر ایک سے بڑھ کر ایک مضمون، انتخاب دشوار ہونے لگا، مجبوراً یہ طے کیا گیا کہ اس شمارے کے ایک سو بارہ صفحات میں سے سو صفحات ان مضامین کے لیے خاص کردیے جائیں، پھر بھی طبیعت پر جبر کرکے بہت سے مضامین کو روکنا پڑا اور جو مضامین دیے گئے، ان میں بھی حک وفک اور حذف وتلخیص کی گستاخی کرنا پڑی، سوائے بعض مضامین کے، جن میں یہ کام مشکل محسوس ہوا، اکثر مضامین سے مکررات خصوصاً سوانحی حصہ حذف کردیا گیا، تاکہ زیادہ سے زیادہ تاثرات اور سبق آموز حصہ شائع ہوسکے۔

جن حضرات کے مضامین اس اشاعت میں شامل نہیں ہوسکے ہیں اور جن کے مضامین میں تلخیص کی گئی ہے ان کی خدمت میں شکریہ ومعذرت کے ساتھ عرض ہے کہ راقم سطور، حضرت سے متعلق آنے والے تمام مضامین جمع کررہا ہے، ان شاء اللہ اس مجموعہ میں یہ تمام مضامین، مکمل شائع ہوں گے، اس کے علاوہ بھی مناسب موقع پر ان کی اشاعت زیر مشورہ ہے، اللہ رب العزت تمام حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

بعض حضرات ایسے ہیں جن سے حضرت مولانا کے متعلق مضامین ہمیں حاصل کرنے تھے؛ لیکن ہم حاصل نہیں کرسکے۔ اسی طرح کچھ منظومات بھی موصول ہوئے ہیں ان سب کے

لیے مناسب وقت اور موقع کا انتظار ہے۔

قارئین کرام سے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ان مضامین کی اشاعت کو، کسی رسم کی تکمیل نہ سمجھیں؛ بلکہ ان کو غور سے پڑھ کر اپنے لیے سبق حاصل کرنے کی فکر کریں خاص طور سے حضرات علماء وفضلاء، مدارس، کہ یہ مضامین جس شخصیت سے متعلق ہیں وہ ایک مثالی شخصیت ہے۔ ان کے تلامذہ ومستفیدین تو کسی حد تک ان کے اوصاف وکمالات سے واقف ہیں؛ لیکن دیگر حضرات کے لیے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دو نہایت محترم وموقر رفقاء ومعاصرین کے ارشادات نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) استاذ گرامی مرتبت حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم نے ارشاد فرمایا کہ: ''تقریر وتحریر میں اور نظم ونثر میں مولانا کا کوئی ثانی دارالعلوم میں نہیں ہے'' نیز فرمایا کہ ''مولانا کی طرح دارالعلوم کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔''

(۲) استاذ گرامی حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم، جو حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے وقتاً فوقتاً مختلف علمی مسائل میں تبادلۂ خیال فرماتے رہتے تھے، فرماتے ہیں کہ: ''میں ان سے یہ کہتا تھا کہ کسی مسئلہ میں جو بات میں آپ کے سامنے پیش کروں اس کے بارے میں آپ کے قلب میں جو رائے ابتدائی طور پر آئے وہ مجھے بتا دیا کریں، اس پر مجھے اطمینان ہو جاتا ہے۔''

ان دو موقر شہادتوں کے علاوہ، ان کے رفیق قدیم، حضرت صدر المدرسین دامت برکاتہم دارالعلوم دیوبند کے تاثرات تو اُن کے مختصر مضمون کی شکل میں شامل اشاعت ہیں، اسی طرح حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم اور حضرات نائبین مہتمم مدظلہما اور دیگر موقر اساتذۂ کرام نیز دیگر کبار علماء کے مضامین بھی آپ کے سامنے آ رہے ہیں۔ ان سب سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اپنے اوصاف وکمالات اور جامعیت کے لحاظ سے ایک نمونہ کی شخصیت تھی۔

کیا لوگ تھے کہ راہ وفا سے گذر گئے

جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

حضرت مولاناؒ کی وفات پر مختلف حلقوں، اداروں اور شخصیات کی جانب سے اظہار تعزیت

کیا گیا، اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہم یا حضرت مولاناؒ کے پسماندگان کے نام تعزیتی خطوط موصول ہوئے، ہم ان سب کی خدمت میں شکریہ پیش کرتے ہیں، بالخصوص حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی دامت برکاتہم، حضرت مولانا تقی الدین صاحب مظاہری ندوی دامت برکاتہم، حضرت مولانا جلال الدین عمری صاحب امیر جماعت اسلامی اور حضرت مولانا محمد سعد صاحب کاندھلوی بنگلہ والی مسجد نظام الدین دہلی وغیرہم۔

=========================

حضرت شیخ مولانا محمد یونس صاحب جونپوری کی رحلت

سال رواں کو جس بزرگ نے بھی علماء ومحدثین کی وفات کا سال کہا تھا وہ ایسا سچ ثابت ہوا کہ قضاء الٰہی نے میدان علم وفن کی متعدد شخصیات سے ہمیں محروم کردیا، خاص طور سے طبقۂ محدثین کی چار اہم شخصیات، سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور نصف صدی سے زائد بخاری شریف پڑھانے والی شخصیت حضرت مولانا عبدالحق اعظمی رحمہ اللہ کا حادثۂ وفات پیش آیا، اس کے بعد استاذ المحدثین اور شیخ الکل کے نام سے متعارف شخصیت حضرت مولانا سلیم اللہ خاں رحمہ اللہ رخصت ہوئے۔ پھر چند ماہ کے بعد دورشباب سے خدمت حدیث میں مشغول نیز حدیث اور خصوصاً درایت حدیث میں انتہائی گہری نظر کی حامل شخصیت حضرت مولانا ریاست علی بجنوری رحمہ اللہ سے ہم محروم ہوئے اور آخر میں اس قافلہ کے گل سرسبد حضرت شیخ مولانا محمد یونس صاحب جونپوری رحمہ اللہ شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، داغ مفارقت دے گئے۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

حضرت شیخ قدس سرہٗ فن حدیث میں موسوعی انداز کی شخصیت کے مالک تھے، اور ان کو طبقہ علماء میں بڑا احترام حاصل تھا، وہ اپنے اساتذۂ کرام بالخصوص شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا

کاندھلوی نوراللہ مرقدہ کے حسن تربیت کا عکس جمیل تھے، انھوں نے اپنی انتھک محنت سے اپنے اکابر کا نام روشن کیا اور خود اپنا نام زندۂ جاوید کرگئے۔ اللہ رب العزت کی توفیق سے انھوں نے پورے پچاس برس بخاری شریف کا درس اس شان سے دیا کہ ابتدائی سالوں ہی میں ان کی وسعت مطالعہ کی دھاک بیٹھ گئی اور پھر ان کی شخصیت کی عظمت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور آج وہ اس حال میں رخصت ہوئے ہیں کہ ان کی نظیر تلاش کرنا مشکل محسوس ہو رہا ہے۔

ان کی شخصیت سلوک وتصوف اور روحانیت میں بھی بہت بلند تھی اور اس راہ سے بھی ان سے بڑا فیض مسلمانوں اور خصوصاً طبقۂ علماء کو پہنچا۔ دعاء ہے کہ اللہ رب العزت ان کی خدمات وحسنات کو قبول فرما کر اپنے قرب خاص سے ہمکنار فرمائے، آمین!

==========================

ارباب مدارس کی خدمت میں ایک ضروری گذارش

ملک کے موجودہ حالات میں بعض مخصوص اسباب کے تحت، مدارس اسلامیہ پر حکمراں طبقہ کی خاص نظر ہے اور مختلف انداز سے مدارس کے لیے مسائل کھڑے کرنے کی کوشش جاری ہے۔ ان حالات میں تمام اہل مدارس کو چاہیے کہ اپنی داخلی وخارجی خامیوں کی اصلاح پوری سنجیدگی سے کریں۔ تمام سرکاری وقانونی کارروائیوں کی تکمیل کریں اور اس بات کی کوشش کریں کہ ہماری کسی کمزوری کی بناء پر ان کو انگلی رکھنے کا موقع نہ ملے۔ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کی جانب سے مختلف اوقات میں رابطۂ مدارس اسلامیہ عربیہ کے رکن مدارس کے نام جاری ہونے والی تجاویز اور مشوروں سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے، رابطہ کے رکن مدارس خود ان تجاویز کو نافذ کریں اور دیگر مدارس تک بھی ان مشوروں کو پہنچانے کی کوشش کریں۔

❁ ❁ ❁

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ
ایک جامع کمالات شخصیت

از: حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند

یہ مضمون ۲۸؍شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۵؍مئی ۲۰۱۷ء بروز جمعرات، جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے ''مسجد عبدالنبی'' نئی دہلی میں منعقدہ تعزیتی اجلاس کی صدارتی تقریر پر مبنی ہے

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف خصوصیات اور ان کے اوصاف وکمالات کو مختلف حضرات نے تحریراً یا تقریراً اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے اور کررہے ہیں۔ ان سب کا اعتراف کرتے ہوئے، میں نے جو خصوصیات اپنے طور پر محسوس کی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔

حضرت مولانا مجھ سے سینئر تھے، مگر ہم استاذ تھے یعنی حضرت مولانا سید فخر الدین احمد مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو شرفِ تلمذ اور خصوصی تعلق حاصل تھا اور حضرت ان کے اوپر بہت اعتماد فرماتے تھے اور ''ایضاح البخاری'' کی ترتیب اسی اعتماد کا نتیجہ تھی، اور اس ناکارہ کو بھی حضرت مولانا فخر الدین احمد مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے شاگردی کا تعلق رہا اور حضرت کا اعتماد بھی حاصل رہا اور بندے نے بھی مکمل بخاری شریف کی تقریر حرف بحرف لکھنے کی کوشش کی جو محفوظ ہے، میں نے محسوس کیا کہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو کئی سال تک مسلسل درس کی سماعت کی ہے اور بار بار اسباق کو نوٹ کیا ہے پھر مرتب کرنے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا ہے تو درحقیقت حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ بخاری کی جو خصوصیات تھیں، ان سب کو اس کے اندر منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

عام علماء کے لیے عمومی طور پر اور حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ جن کو آج کہیں درسِ بخاری یا درسِ حدیث کی سعادت حاصل ہے، ان کے لیے خاص طور پر ''ایضاح البخاری'' ایک بہت بڑا سرمایہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارناموں میں اگر کوئی اور چیز نہ ہوتی تو تنہا ایضاح البخاری کی ترتیب ان کو بقائے دوام دینے کے لیے کافی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی وہ سلسلہ جاری ہے، دس جلدیں اس کی مکمل ہوچکی ہیں اور یہ سفر اتمام کی جانب رواں دواں ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کی شکلیں پیدا فرمائے۔

علمی کمالات وخصوصیات کے علاوہ، مزاج اور اخلاق کے اعتبار سے مولانا کی زندہ دلی اور خوش مزاجی ایک نمایاں خصوصیت تھی، جس سے ان کا ہر ملنے والا واقف ہے، مجھے رسمی طالب علمی کے بعد سے اس ذمہ داری کے آنے تک اور اس کے بعد مجلسِ تعلیمی میں بار بار ملاقات کا موقع ملا؛ لیکن مولانا کو کبھی **عَبُوسًا قمطريرًا** نہیں دیکھا، کہ چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی ہو، پیشانی پر بل پڑا ہوا ہو، چہرہ سرخ ہورہا ہو، کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا، ہمیشہ مسکراتے ہوئے پایا، ان کی جامع ومختصر گفتگو زندہ دلی اور خوش مزاجی کا پورا پورا مظہر ہوتی تھی۔ اسی کے ساتھ گفتگو میں برجستگی ہوتی تھی، کوئی بات ہوئی فوراً دو لفظوں میں اس کا جواب اور جس طرح پھلجھڑی چھوٹ جاتی ہے، مجلس کے اندر مولانا کی وہ مختصر سی بات سب کے اوپر بھاری ہوجاتی تھی، گفتگو میں بھی سادگی اور مزاج میں بھی سادگی ان کا امتیاز تھی۔

غور وفکر کے بعد جو رائے قائم کرلیتے اس کے اوپر پختہ رہتے، فوراً رائے بھی نہیں دیتے تھے، اگر کوئی مسئلہ، مجلسِ تعلیمی میں یا اساتذہ کے مشورے میں زیرِ غور ہوتا، حضرت سب کی باتیں خاموشی سے سنتے رہتے اور غور کرتے رہتے تھے، اگر کوئی بات سمجھنے کی ہوتی تو سوال کرلیتے؛ لیکن رائے اخیر میں دیتے تھے، جب پوچھا جاتا کہ حضرت آپ کی کیا رائے ہے؟ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ پورے مجمع کی رائے ایک طرف رہ گئی ہے اور مولانا ریاست علی صاحب نے جو رائے اخیر میں پیش کی وہ سب کے اوپر حاوی ہوگئی اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوا۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ اختلافِ رائے میں بھی حدود پر قائم رہتے تھے، یہ بڑی اہم بات تھی۔ علماء کے درمیان مسائل میں اختلاف کوئی اہم بات نہیں ہے، ائمہ کے درمیان بے شمار مسائل میں اختلاف ہے، یہاں تک کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تو صرف نماز میں تکبیرِ تحریمہ سے سلام تک ائمہ کے اختلافی مسائل شمار کیے تو وہ دوسو کے قریب تھے۔ تو نفسِ اختلاف کوئی بری چیز نہیں ہے، ہاں اختلاف اخلاص کے ساتھ اور دلائل کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور اس

کی حدود ملحوظ رہنی چاہئیں، نفسانیت نہیں آنی چاہیے۔ اس مضمون کو حضرت شیخ الحدیثؒ کی کتاب ''الاعتدال فی مراتبِ الرجال'' اور حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کی کتاب ''حدود اختلاف'' میں دیکھنا چاہیے۔ مدارس میں علماء کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے؛ لیکن وہ اس وقت زحمت بن جاتا ہے، جب اس کو حدود میں نہ رکھا جائے اور اس کا جو طریقہ ہے اسے نظرانداز کردیا جائے۔ مولانا کے یہاں بھی اختلاف رائے ہوتا تھا؛ لیکن بڑی سنجیدگی کے ساتھ۔

مولانا کی ایک خاص صفت، چھوٹوں سے کام لینا اوران کی ہمت افزائی کرنا تھا، اپنے تلامذہ اوراہلِ تعلق کو ''بیٹے'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اگر ان کے پاس کوئی اپنا کام لے کر گیا اوراس میں کچھ کمی کوتاہی بھی ہے تو فوراً نکیر نہیں؛ بلکہ بہت اچھا ماشاء اللہ اچھا کام کیا؛ لیکن اس کو ایسے کرلو تو بہتر ہے۔ اس طرح اس کی اصلاح بھی ہوجاتی اور حوصلہ افزائی بھی۔

مولانا کی یہ شفقت ومحبت اور خوش مزاجی زندگی کی آخری رات تک برقرار رہی؛ بلاشبہ ان کی یہ صفات قابلِ تقلید ہیں جنھیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور دارالعلوم کو اُن کا نعم البدل عطا فرمائے!

❀ ❀ ❀

صاف دل انسان چل بسا

از: حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری مدظلہٗ العالی
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

انسانوں میں دُرِّ نایاب کی کمی ہمیشہ محسوس کی گئی اور انسانی امتیازات متنوع ہیں، ہر امتیاز اپنے اندر کوئی خوبی رکھتا ہے، حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری قُدِّس سِرُّہ بہت سی خوبیوں اور امتیازات کے مالک تھے، لکھنے والے اُن پر لکھیں گے۔ مجھے شخصیات پر لکھا نہیں آتا؛ میرے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قُدِّس سِرُّہ سے بھی جب کوئی کسی شخصیت کی سوانح لکھنے کے لیے اصرار کرتا تو حضرت یہی فرماتے تھے کہ مجھے شخصیات پر لکھنا نہیں آتا۔

میری حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمہ اللہ سے لمبی رفاقت رہی ہے، وہ میرے ہم عمر تھے؛ مگر مجھ سے پانچ سال پہلے فارغ ہوگئے تھے؛ اس لیے کہ وہ بہت ذہین تھے اور بہت تیزی سے پڑھا تھا اور میں ہدایہ اولین سے پہلے مظاہر علوم سہارن پور میں علوم عقلیہ اور فنون کی بہت سی کتابیں پڑھنے میں لگ گیا تھا؛ اس لیے میں پیچھے رہا تھا؛ حالاں کہ ہم دونوں کی پیدائش ایک سال (۱۹۴۰ء) کی ہے۔ میں نے جب دارالعلوم میں آکر ہدایہ اولین میں داخلہ لیا تو وہ فارغ ہوگئے تھے اور ''گل کدہ'' (دیوبند میں کمال شاہ مسجد کے پاس) میں کمرہ کرایہ پر لے کر رہتے تھے اور ''ایضاح البخاری'' لکھتے تھے، میں نے بھی ''گل کدہ'' میں کمرہ کرایے پر لیا تھا، مجھے دارالعلوم میں سیٹ نہیں ملی تھی، اس وقت سے حضرت مولانا کے ساتھ دید وشنید تھی، پھر زمانے نے کروٹ لی، میں فارغ ہوکر راندیر چلا گیا اور وہ جمعیۃ علمائے ہند میں ملازم ہوکر چلے گئے، وہاں سے وہ دارالعلوم میں مجھ سے پہلے مدرس ہوکر آگئے، میں ان سے دو تین سال بعد آیا، پھر تقریباً چالیس سال تک ہم دارالعلوم کی خدمت کرتے رہے، حضرت مولانا قدس سرہ نے متعدد عہدے سنبھالے، میں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا، میں صرف پڑھاتا رہا؛ مگر میں مولانا کے ساتھ اُن کے کاموں میں شریک رہا، جب وہ شیخ الہند اکیڈمی کے

ڈائرکٹر بنے تو میں نے اپنے برادر حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری کے ساتھ مل کر، حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی ''ادلۂ کاملہ'' کی تسہیل کی، جسے مولانا نے شیخ الہند اکیڈمی سے شائع کیا، پھر مولانا کے اشارے پر میں نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر حضرت شیخ الہند کی ''ایضاح الادلہ'' تیار کی، وہ بھی اکیڈمی سے شائع ہوئی، یہ دونوں کتابیں اکیڈمی کا اہم کارنامہ قرار پائیں۔

پھر جب دارالعلوم میں انقلاب آیا تو حضرت مولانا ''رسالہ دارالعلوم'' کے ایڈیٹر بنائے گئے، اس میں میرا کوئی حصہ نہیں تھا؛ کیوں کہ وہ خود بڑے ادیب تھے، میری معاونت کی ضرورت نہیں تھی؛ مگر جب وہ ناظمِ تعلیمات بنائے گئے تو میں نے قدم قدم پر اُن کا ساتھ دیا؛ اس لیے ان کو قریب سے پڑھنے کا موقع ملا، میرے نزدیک ان کا امتیازی وصف اخلاص اور صاف دلی تھا، ان کے دل میں کسی سے بیر نہیں تھا، وہ کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے، ہر ایک کے حق میں وہ خیر چاہتے تھے اور اسی وصف کی وجہ سے اُن کو جو کام دارالعلوم سپرد کرتا تھا بحسن وخوبی انجام دیتے تھے، چیئرمین حضرت مولانا محمد عثمان صاحب (نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند) ان کے حق میں فرمایا کرتے تھے:

''ریاست ایسا پرزہ ہے، جس کو جہاں فٹ کردو فٹ ہوجاتا ہے۔''

حالاں کہ منتظم سے عام طور سے لوگوں کو شکایت ہوتی ہے؛ مگر حضرت مولانا قدس سرہ سے کسی کو شکایت نہیں ہوتی تھی۔ میرے خیال میں اس کی وجہ ان کی صاف دلی تھی، ہزار خوبیوں سے بڑھ کر یہ خوبی تھی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرتِ عامہ تامہ فرمائیں اور ان کو بلند درجات عطا فرمائیں!

❁ ❁ ❁

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ
دارالعلوم کے لیے مفید تر شخصیت

از: حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی مدظلہٗ
نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، دنیا سے اچانک رخصت ہوگئے اور ایسے وقت میں جب کہ دارالعلوم کو ان کی ضرورت تھی اور ان کی بیماری کے باوجود بہ ظاہر ایسا اندیشہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح چلے جائیں گے۔ اُن کی وفات سے طبیعت آج تک متاثر ہے، ایسا اثر شاید ہی کسی اور حادثے کا ہوا ہو اور اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ وہ دارالعلوم کے لیے مفید تر شخصیت تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے، انتظامیہ کی تبدیلی کے بعد دارالعلوم کے لیے ان سے زیادہ مفید کسی کو نہیں پایا، وہ کسی بھی ذاتی مفاد سے بالاتر ہوکر دارالعلوم کے حق میں سوچتے تھے؛ بلکہ اپنی ذات کو نقصان پہنچا کر دارالعلوم کے مفاد میں مشورہ دیتے تھے۔ گذشتہ پینتیس چالیس سال کے عرصہ پر نظر ڈال کر سوچا جائے تو یاد آتا ہے کہ ہر آڑے وقت میں، دارالعلوم کے سب سے زیادہ وہی کام آئے اور سہارا بنے۔

ان کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ اگر ان سے کسی شخص کی شکایت کی جاتی تو وہ اس شخص کو اس طرح افہام وتفہیم کرتے کہ نہ اس کو شکایت کرنے والے سے بدگمان ہونے کا موقع ملتا اور نہ اپنی غلطی سے انکار کی مجال ہوتی۔ اس طرح بہت آسانی سے غلطی کی اصلاح بھی ہوجاتی اور ماحول میں کسی بدگمانی اور دوری پیدا ہونے کا امکان بھی نہ رہتا۔

یہ تو دارالعلوم کے معاملات میں ان کے مثالی طرزِ عمل کا خلاصہ ہے، اس کے علاوہ ذاتی اوصاف میں ان کی خوش اخلاقی، وسعتِ ظرفی، مہمان نوازی اور غریب پروری سے تو ہر خاص وعام

واقف ہے۔ جو شخص بھی اُن کے پاس آجائے اس کی پریشانی دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ اگر ضرورت ہوتو سفارش کر دیتے تھے، اگر کوئی اور پریشانی یا مالی ضرورت ہوتو ہر حال میں مدد کرتے تھے، اُن کی اور ان کی اہلیہ مرحومہ کی داد و دہش اور غریب پروری سے، دیوبند کے مرد وزن اور خاص و عام سب واقف اور اس کے معترف ہیں (اہلیہ مرحومہ شاید اس وصفِ خاص میں اور فائق تھیں) بسا اوقات کسی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے قرض بھی لیا کرتے تھے، خود مجھے بعض مرتبہ فون کرکے فرمایا کہ فلاں آدمی کو اتنی رقم قرض چاہیے اور امید یہ ہے کہ ادا کردے گا اور اگر آپ کو اس پر اعتماد نہ ہوتو آپ مجھے قرض دے دیں، میں اس کو دے دوں گا اور ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔

مولانا مرحوم کے ان اوصافِ حسنہ کا یہ اثر ہے کہ ان کے جانے کے بعد ہر شخص ان کا ذکرِ خیر کررہا ہے اور ان کو تعریف کے ساتھ ہی یاد کرتا ہے۔ اور ان کے انھی اوصاف اور خاص طور پر دارالعلوم کے لیے ان کی افادیت واخلاص کا نتیجہ ہے کہ ہماری طبیعت ان کے حادثۂ وفات سے بہت متاثر ہے۔ اللہ رب العزت ان کی حسنات قبول فرمائے اور اپنے قربِ خاص سے نوازے۔ آمین!

❁ ❁ ❁

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ

ایک مخلص ومہربان شخصیت

از: حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی زیدمجدہٗ
نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نوراللہ مرقدہ ہمارے استاذ تو نہیں تھے؛ لیکن درحقیقت ہمارے اساتذہ ہی کے صف کے آدمی تھے؛ اس لیے کہ ان کا دارالعلوم میں تقرر، ہماری طالب علمی کے آخری سال میں ہوگیا تھا، اُسی وقت سے ان کو دیکھا، خاص طور سے جب کبھی حضرت الاستاذ شیخ الحدیث حضرت مولانا فخرالدین احمد مرادآبادی نوراللہ مرقدہ کے یہاں اس زمانے میں (جوحضرت کی حیاتِ طیبہ کا بھی آخری سال تھا) جانا ہوا تو حضرت مولاناؒ کو وہاں ضرور پایا، اس طرح طالبِ علمی ہی کے زمانے سے ان کی شخصیت سے واقف ہونے کا موقع ملا۔

اس کے بعد جب ۱۴۰۲ھ میں ہمارا دارالعلوم میں تقرر ہوگیا تو حضرت مولانا کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اس دور میں وہ ابتداءً نائب ناظم اور کچھ ہی عرصہ بعد ناظمِ مجلس تعلیمی کی حیثیت سے دارلعلوم کی تعلیمی سرگرمیوں کے روحِ رواں تھے۔ اس حیثیت سے ان کی شفقت ومحبت کا خوب تجربہ ہوا؛ حالانکہ وہ انتظامی منصب پر فائز تھے؛ لیکن ان کا طرزِ عمل اتنا متوازن ہوتا تھا کہ کسی کو ان سے شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ہر ایک کے لیے اخلاص وہمدردی ان کا خصوصی وصف تھا، ذاتی طور پر راقمِ سطور کے ساتھ اُن کا طرزِ عمل ایک مشفق ومخلص سرپرست کا سا تھا، ہمیشہ محبت کا اظہار فرماتے اور مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔

ان کے مخلصانہ مشوروں اور شفقت ومحبت کا اس وقت سے اور زیادہ تجربہ ہوا جب راقم کے کاندھوں پر موجودہ ذمہ داری آئی، اس زمانے میں ان کے مشورے اور رہنمائی سے خوب مستفید

ہونے کا موقع ملا۔ مشورہ کی مجالس میں بھی اُن کی اصابتِ رائے سامنے آتی رہی، وہ جو بھی رائے پیش فرماتے تھے وہ تدبر ودوراندیشی کا مظہر ہوتی تھی، پھر رائے پیش کرنے کا اُن کا طریقہ بھی قابلِ تقلید تھا، وہ اپنی بات نہایت سلیقہ سے، مناسب الفاظ اور خوشگوار لہجہ میں پیش فرماتے اوران کو اپنی رائے پر اصرار نہیں ہوتا تھا؛ جب کہ عام طور پر ان کی رائے، سب سے زیادہ باوزن ہوتی تھی۔

ذاتی طور پر راقم کے ساتھ یہ معاملہ بھی تھا کہ اگر میری کوئی تحریر ان کی نظر سے گذرتی اوراس میں کوئی بات ان کو قابلِ اصلاح محسوس ہوتی تو پوری ہمدردی کے ساتھ اس کی نشاندہی فرماتے اوراس میں حوصلہ افزائی کا پہلو بھی ہاتھ سے نہ جاتا، یہ ان کی محبت واخلاص کی واضح دلیل تھی۔ مجموعی اعتبار سے وہ دارالعلوم کے ماحول میں ایک انتہائی مشفق، مخلص اورمہربان سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے؛ اسی لیے ان کے حادثۂ وفات سے ہر شخص متاثر ہوا ہے۔

اللہ رب العزت حضرت کی مغفرت فرمائے اوران کی حسنات کا بہترین بدلہ عطا فرمائے!

❀ ❀ ❀

دارالعلوم دیوبند کے مردِ ذکی و دوُر اندیش
حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری رحمۃ اللہ علیہ

بہ قلم: مولانا نور عالم خلیل امینی
چیف ایڈیٹر ''الداعی'' عربی واستاذ ادبِ عربی
دارالعلوم دیوبند

یاد سے تیری، دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

شنبہ: ۲۳ رشعبان ۱۴۳۸ھ=۲۰ رمئی ۲۰۱۷ء کو یہ راقم اپنے معالجین کے مشورے کے مطابق، اپنی رہایش گاہ افریقی منزل قدیم، نزد چھتہ مسجد کے صحن میں نماز فجر کے بعد چہل قدمی کرر ہا تھا کہ دارالعلوم کی مسجدِ قدیم کے مناروں سے بلند ہونے والے اِس اِعلان نے انتہائی حزن وملال کے ساتھ بے پایاں حیرت میں ڈال دیا کہ دارالعلوم کے استاذ حدیث حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کا ابھی ذرا دیر پہلے انتقال ہوگیا ہے، إِنَّا لِلّٰهِ وإِنَّا إِلَيْهِ رٰجِعُونَ. راقم کے تجسس کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ ۳-۴ بجے قبیلِ اذانِ فجر، اُن کو سانس لینے میں تکلیف محسوس ہوئی تو اُنھوں نے فرزندِ اکبر مولانا سفیان سلّمہٗ کو فون کیا، وہ کسی قریب کے ڈاکٹر کو بلانے گئے کہ اتنے میں اُن کی روح پرواز کرگئی۔ وقت کوئی W بجے صبح کا تھا۔

مرحوم کی وفات کے اعلان پر حیرت اِس لیے ہوئی کہ اُن کے متعلق معلوم تھا کہ وہ حالیہ دنوں میں کسی تشویش ناک عارضے میں مبتلا نہ تھے؛ بل کہ معمول کی زندگی گزار رہے تھے، ہر چند کہ وہ عرصۂ دراز سے شکر کے موذی مرض کا شکار تھے، اس کی وجہ سے انھیں دل اور گردے وغیرہ کی تکلیف رہتی تھی، وہ چند ماہ قبل بھی اِسی سلسلے میں دیوبند کے مشہور ڈاکٹر ''ڈی، کے، جین'' کے ہسپتال میں بہ غرضِ علاج کئی روز داخل رہے، اس وقت قدرے تشویش کی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی؛ لیکن الحمدللہ وہ اس سے صحت یاب ہوکر اپنے گھر آ گئے۔ یہ راقم ہسپتال تو اُن کی عیادت کو اپنی کم زوری اور امراض کی وجہ

سے نہ جاسکا؛ لیکن ہسپتال سے اُن کی گھر واپسی کے ایک آدھ روز کے بعد اُن کے دولت کدے پر اُن کی عیادت کو پہنچا تو جسمانی کم زوری — جس کا اثر اُن کی آواز پر بھی تھا — کے باوجود وہ چست تھے، مزاج پرسی پر ایسے الفاظ کہے جیسے اُن کو کوئی بڑی تکلیف نہ تھی اور نہ ہے۔ یہ اُن کی افتاد تھی کہ وہ کسی مسئلے کو زیادہ اوڑھتے نہ تھے، صبر وتحمل اور توکل سے اُن کا خمیر اٹھا تھا۔ وہ بڑے سے بڑے مسئلے سے گھبراتے نہ پریشان ہوتے، اعصاب پر ایسا قابو رکھنے والا اور مشکل اوقات میں بھی متبسّم رہنے والا راقم نے اُن کے ایسے کم لوگوں کو پایا ہے۔

حزن وملال کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ دارالعلوم کے مدرسین کے خاندان کے بہت سی وجوہات کی وجہ سے ممتاز فرد تھے، اُن کی وفات کی خبر سے ایسا لگا کہ کوئی لاثانی گوہر کھوگیا ہے، وہ دارالعلوم کے نمایاں معاصر فضلا میں تھے، دورۂ حدیث میں اپنے سارے رفقاے درس سے فائق رہے، وہ علمی پختگی اور ٹھوس لیاقت کے ساتھ ساتھ ذہانت واِصابت راے، معاملہ فہمی، دور بینی، ظرافتِ طبعی، حاضر جوابی، شریں کلامی، سُخن وری، طلاقتِ لسانی، سلاستِ قلمی، تقریری شستگی اور خوش خطی میں طاق تھے۔ اکثر طلبہ ومدرسین وملازمین اُن سے اپنے مسائل میں مشورہ کرنے اور رائے لینے اُن کے پاس جاتے، وہ ہر ایک کو اُس کے متعلقہ مسئلے میں ایسا مشورہ دیتے، جس سے وہ مسئلہ بہ حسن وخوبی ضرور حل ہوجاتا تھا۔ دارالعلوم کے اعلیٰ ذمے داروں؛ بالخصوص سابق مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن قُدِّسَ سِرُّہٗ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء = ۱۴۳۲ھ/۲۰۱۰ء) کے تو وہ دارالعلوم کے پیش آمدہ پیچیدہ معاملات میں خصوصی مشیر ومعتمد تھے۔ حق یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد دارالعلوم کو جو حالات ومعاملات مسلسل پیش آئے، اُن میں سے بہت سے معاملے اُنھی کے مشورے سے حل ہوے یا اُن کے حل ہونے کی راہ ہم وار ہوئی۔ وہ جس دَور میں دارالعلوم سے فارغ ہوے، وہ اور اس سے قبل کے ادوار ایسا لگتا ہے کہ دارالعلوم کا تخلیقی دورِ بہار تھے، اس زمانے کا ہر فاضل ہمہ جہت علمی صلاحیت، انتظامی لیاقت اور مردم گری کی غیر معمولی اہلیت کا حامل نظر آتا ہے اور مولانا ریاست علی جیسے نام ور فضلا کا تو پوچھنا ہی کیا۔

شنبہ: ۲۳رشعبان = ۲۰رمئی ہی کو نمازِ عصر کے بعد اُن کی نماز جنازہ، دارالعلوم کے احاطۂ مولسری میں، دارالعلوم کے استاذِ حدیث اور جمعیۃ علماے ہند (م) کے صدر حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری مدظلہٗ نے پڑھائی۔ دارالعلوم اور دیگر سارے مدرسوں میں رمضان کی تعطیلِ کلاں کا زمانہ تھا جو عموماً ۱۵رشعبان یا اس سے پہلے سے شروع ہوجاتا ہے، اس کے باوجود دیوبند کے عمائدین وعوام کے علاوہ علما وطلبہ کے جمِّ غفیر نے مرحوم کے جنازے اور تدفین میں شرکت کی۔

افسوس ہے کہ دل کی بائی پاس سرجری کی وجہ سے، جس پر چند ہی روز گزرے تھے اور ڈاکٹروں نے زینہ چڑھنے اترنے نیز نشیب وفراز عبور کرنے سے منع کر رکھا تھا، یہ راقم مرحوم کی، دیوبند میں رہتے ہوئے، آخری دید کرسکا نہ نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کی سعادت حاصل کرسکا، جس کا ہمیشہ قلق رہے گا۔ فون ہی سے مرحوم کے فرزند خرد مولانا سعدان سلّمہٗ سے تعزیتی کلمات کہے تو آواز اتنی رینددھ گئی کہ وہ الفاظ صحیح طور پر ادا نہ ہوسکے اور بہ مشکل غیر مربوط طور پر ادا کردیے گئے۔

کئی روز تک ایسا رہا کہ جو اساتذہ وطلبہ راقم کی عیادت کو آتے رہے، اُن سے زیادہ تر مولانا مرحوم ہی کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اُن کی یاد کے ساتھ ہی اکثر آواز گلوگیر ہوجاتی اور جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہوجاتا، اندازہ نہ تھا کہ مرحوم سے راقم کو ایسا دلی تعلق ہے؛ لیکن انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی شے یا شخص کی قدر اس کے فوت ہوجانے کے بعد ہی کرتا ہے۔ مرحوم کی وفات سے دارالعلوم میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پر ہونا بہ ظاہرِ احوال مشکل معلوم ہوتا ہے، گو خدائے قادر ووہّاب ہر چیز پر ہر وقت قادر ہے۔ اِعجازِ الٰہی ہے کہ وہ اہلِ کمال کو بھی کمالات کے الگ الگ گوشوں کا حامل بناتا ہے؛ اِس لیے کسی بھی اہلِ کمال کے اُٹھ جانے کے بعد ایسا خلا ہوجاتا ہے جو دیگر سارے زندہ اہلِ کمال مل کر بھی پورا نہیں کرپاتے؛ کیوں کہ فوت شدہ باکمال ایسا ہیرا ہوتا ہے جو تنہا حالات کے بہت سے ناگزیر تقاضوں کے نگینے میں صحیح طور پر فٹ ہوتا ہے؛ اس لیے مسائل کی زلفِ گرہ گیر کو سنوارنے کی جب جب ضرورت پڑتی ہے اور حالات وواقعات کا جب جب اپنا خاص تقاضا ہوتا ہے، وہی اہلِ کمال یاد آتا ہے اور یہ یاد بہت کچھ کے لگاتی ہے کہ کیوں نہ ہم نے اسے کسی جتن کے ذریعے فوت ہونے سے بچائے رکھا؟

مولانا مرحوم جہاں تک میرے علم میں ہے دارالعلوم کے اساتذۂ گرامی کے درمیان تنہا مجلسی روایت کے امین رہ گئے تھے، عصر کی نماز کے بعد اُن کے پاس دسیوں اساتذہ وطلبہ اور بعض دفعہ بعض اہلِ شہر آجاتے، مرحوم ہر ایک کی چائے سے تواضع فرماتے، کوئی بھی کسی موضوع کو چھیڑ دیتا خواہ دینی ہو یا دنیوی، علمی ہو یا ادبی، عام حالاتِ حاضرہ سے اس کا تعلق ہو یا خاص دارالعلوم کے کسی تازہ معاملے سے؛ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نکتہ آفرینی، شگفتہ گوئی اور بذلہ سنجی مجلس کو زعفران زار بنادیتی، جس سے لوگ تا دیر؛ بل کہ بعض دفعہ کئی دنوں تک اور ہفتوں ومہینوں تک محظوظ ہوتے رہتے۔ یہ رنگ اُن کی خاص مجلس ہی کا نہ تھا؛ بل کہ کوئی مجلس ہو اگر مولانا ریاست علی بجنوری اس میں موجود ہوتے تو مجلس کی خشکی اُن کے پرکیف ظریفانہ جملوں سے ضرور کافور ہوتی رہتی؛ حتی کہ دارالعلوم میں جو

میٹنگیں دارالعلوم کے ذمے داراعلیٰ کی طرف سے بلائی جاتیں وہ بھی مولاناؒ کی نشاط انگیز اور روح افزا معنی آفرینیوں سے بہرہ یاب ہونے سے کبھی محروم نہ رہتیں، لوگ مجلس سے نکلتے تو اُنھیں اُن نکتوں سے اس طرح لطف لیتے ہوئے پایا جاتا، جیسے لوگ کسی تازہ دم کردینے والے بے مثال نشاط انگیز مشروب کو لینے کے بعد، تادیر مزے لیتے رہتے ہیں۔ اُن کا ایک ظریفانہ جملہ تو مثل اور کہاوت کی طرح زبان زدِ خاص وعام ہے جو اُنھوں نے دارالعلوم کے ایک استاذ کو جو اُن کے ہم سبق ہیں، اُس وقت کہا تھا، جب اُنھوں نے ایک مجلس میں اُن سے یہ کہا کہ تم دارالعلوم میں میرے بعد مدرس ہوئے تھے؛ اس لیے تم جونیئر ہو اور میں تم سے سینئر ہوں، مولاناؒ نے برجستہ اُن سے فرمایا: ''دارالعلوم نے کسی نامعلوم حکمت کے تحت مجھے اُس وقت تک تدریسی خدمت کے لیے نہیں چنا؛ جب تک میری صلاحیت گھٹتے گھٹتے تمھارے برابر نہیں ہوگئی''۔ اس جملے کی چستی اور برجستگی پر لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ مولاناؒ کے جملے اور تعبیرات کا انداز ''بیانیہ'' نہیں ہوتا تھا؛ بل کہ عموماً اُن میں تہہ داری اور معنویت ہوتی تھی۔

مولانا کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ معاشرتی زندگی جینے کے فن میں بڑے ماہر تھے۔ کوئی آدمی اُن سے کوئی معاملہ کرکے کبھی بے مزہ نہ ہوتا تھا؛ کیوں کہ وہ کسی بات پر خواہ وہ کتنا ہی غصہ دلانے والی ہو زبان سے یا چہرے مہرے کی کسی ادا سے خفگی کا اظہار کرتے نہ برا ماننے کی کیفیت نمایاں ہونے دیتے، وہ اشتعال انگیز صورتِ حال میں بھی شگفتہ رو اور خندہ جبیں رہتے۔ آج بعد از مرگ بھی، اُن کی شبیہ جب بھی میرے خانۂ خیال میں آتی ہے تو ہ شاداب نظر آتی ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ ہوتا رہا ہوگا کہ وہ اُن سے ناخوش ہیں؛ کیوں کہ اُن کی خندہ روئی اور معنویّت وظرافت سے پُر اُن کے جملے مخاطب کو اُن کے متعلق کسی منفی سوچ پر کبھی آمادہ نہ ہونے دیتے تھے؛ اِسی لیے اُن کے دشمنوں کی تعداد شاید و باید اور دوستوں کی تعداد بے شمار تھی۔ اُنھوں نے لوگوں کو اپنی ادائے زندگی سے خوشی ہی دی، رنج وغم سے اُنھیں ہمیشہ دور رکھا۔ اُن سے ملنے والوں کو سکون واطمینان کا سرمایہ ملا، انتشار وتشویش کی کسی صورتِ حال سے کبھی واسطہ نہ ہوا۔ اِس طرح کا آدمی پسِ مرگ اپنے بعد کے لوگوں کو بہت یاد آتا ہے جو اُن کا صرف ذکرِ خیر کرتے اور بے پناہ دعاؤں سے نوازتے ہیں؛ اسی لیے اُن کی وفات کے بعد جتنے لوگوں سے راقم کی ملاقات ہوئی سب ہی بہت رنجیدہ اور متاثر نظر آئے، ہر ایک کو اُن کی خوش اخلاقی وحسنِ معاملہ ودل جوئی بار بار یاد آتی اور دیدہ ودل کو متاثر کرجاتی ہے۔

درس گاہ میں بھی وہ شگفتہ خاطر رہتے۔ اُن کے درس میں اِسی لیے طلبہ کا بہت جی لگتا تھا، وہ

درسی مسائل کو اپنی مرتب ومربوط اور سلیس وشستہ زبان میں اس طرح بیان کرتے کہ وہ دورانِ درس ہی طلبہ کے ذہنوں میں اتر جاتے۔ اس سلسلے میں دو باتیں اُنھیں بہت کام دیتی تھیں: ایک تو یہ کہ اُنھیں اُن مضامین پر مکمل عبور تھا جنھیں وہ پڑھاتے تھے؛ کیوں کہ طبعی ذہانت اور اپنی محنت سے اُنھوں نے اپنی طالب علمی ہی میں تمام علوم وفنون میں کمال حاصل کرلیا تھا، اسی کے ساتھ وہ سابقہ تیاری اور مطالعہ کے بغیر کبھی درس گاہ میں نہ آتے تھے، نیز عرصۂ دراز سے درس وتدریس کے مشغلے نے اُن کی تدریسی صلاحیت کو چار چاند لگادیے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اُن کی فصاحتِ لسانی اور شگفتہ بیانی ہمہ وقت اُن کا ساتھ دیتی تھی۔ وہ سال ہا سال سے شکر کی تکلیف دہ بیماری میں مبتلا تھے، دبلے پتلے اور منحنی جسم کے تو وہ تھے ہی؛ لیکن درس گاہ اور مجلس میں وہ کبھی ناحاضر دماغ نظر نہیں آئے؛ بل کہ ہمیشہ وہ فی البدیہہ گو اور حاضر جواب و برجستہ بیاں رہے، تاحیات اُن کی یہ خوبی قائم رہی اور بیماری یا بڑھاپے سے متاثر نہیں ہوئی۔ اُن کی نکتہ سنجی ومعنی آفرینی اِس پر مستزاد ہوتی۔ اُن کے درس کے مقبولیت کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ وہ دیگر تدریسی خصوصیات کے ساتھ ساتھ زبردست ترسیلی وتفہیمی قوت کے مالک تھے، تدریس اور تقریر ہی نہیں عام مجلسی گفتگو کے لیے بھی یہ قوت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ بہت سے لوگ علم وفضل سے بہرہ ور تو ہوتے ہیں؛ لیکن ترسیلی ملکہ سے بے بہرہ ہوتے ہیں؛ اِس لیے وہ نہ صرف اِفادیت کے لائق نہیں ہوتے؛ بل کہ روزمرہ کی زندگی میں بھی اپنی باتوں کی تفہیم سے عاجز رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے گفتگو کرکے تفہیمی صلاحیت کے حامل لوگوں کو بڑی کوفت ہوتی ہے۔

مولاناؒ اپنی اِن خوبیوں کی وجہ سے انتہائی بارآور مدرس کی طرح، زبردست مقرر بھی تھے، اُن کی تقریریں دلچسپ اور کیف آور ہوتی تھیں، اُنھیں اپنی بات کو سمیٹ کر الفاظ کے خوب صورت سانچے میں ڈھالنے میں مہارت تھی۔ وہ لفظ ومعنی میں توازن وہم آہنگی کا خاص خیال رکھتے تھے اور دونوں کی قدر وقیمت اور جاے استعمال کی اہمیت سے خوب واقف تھے، اِس لیے اپنے مطلب کو ادا کرنے کے ہنر میں بھی فرد تھے۔ ہم ایسے لوگوں کو اُن سے بات کرکے اِتنا مزا آتا تھا کہ اسے بیان کرنے کے لیے راقم کے پاس موزوں الفاظ نہیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں اُن کے ایسے چند ہی لوگ دیکھے ہیں، جو اِس صفت میں اُن کے شریک تھے، اُن کی جدائی سے شدید رنج ہوا اور ایسے ہی مولاناؒ کی وفات سے؛ کیوں کہ سُخن وری اور الفاظ وتعبیرات کی نزاکت کی معرفت کی صفت جن لوگوں میں ہوتی ہے، وہ اپنے ایسے دیگر لوگوں کی بھی بے حد قدر کرتے ہیں اور اُن سے مخاطب ہوکر جی اِتنا خوش ہوتا ہے کہ تادیر وہ خوشی قائم رہتی ہے۔ اُن کے برعکس لوگوں سے بات کرکے بہت افسوس ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ

لوگ گھوڑے اور گدھے کے فرق کو ذرا بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ افغانستان اور پھر عراق پر امریکہ کے سراسر ظالمانہ وصلیبی وصہیونی حملے کے دوران راقم نے عربی کے علاوہ اردو میں بھی بہت سے مضامین لکھے جن میں صلیبیت وصہیونیت کے مکروفریب سے دلائل کی روشنی میں پردہ اٹھایا گیا تھا، اخبارات میں مولاناؒ کی نظر اُن میں سے بعض پر پڑی تو اُنھوں نے فون پر بعض تعبیرات کی پسندیدگی کا بہ طورِ خاص راقم سے تذکرہ کیا اور اُن کی خوبیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اُنھیں سراہا اور یہ فرما کر حوصلہ افزائی کی کہ اِن میں جدت طرازی کے ساتھ برجستگی بھی ہے۔ اُن کے سوا کسی اور عالم یا رفیقِ تدریس نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کہی؛ کیوں کہ ہمارے حلقے میں بالعموم زبان کی لذت سے ناآشنائی بھی ہے اور درسیات کے سوا کسی اور کام کی چیز کو پڑھنے سے شدید ''پرہیز'' بھی۔

مولانا کی تحریری نثر میں بلا کی چاشنی اور ایجاز و جامعیت و نفاست ہوتی تھی؛ اِسی لیے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم کی اکثر اہم تحریریں اُنھی سے لکھوائی گئیں۔ بعض دفعہ شوریٰ کی کارروائیوں کے مسودے بھی اُنھی نے ترتیب دیے، مختلف جلسوں کے لیے مہتمم صاحبؒ کی طرف سے خطبۂ صدارت یا خطبۂ استقبالیہ لکھنے کی ذمہ داری اُنھی کے سپرد کی گئی۔

اُن کی نثر کی حلاوت وسلاست کا ایک مختصر سا نمونہ نذرِ قارئیں ہے۔ وہ مولانا کاشف الہاشمیؒ کی خصائل نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...ان ادبی کمالات کے علاوہ، وہ اخلاقِ حسنہ کا پیکرِ جمیل تھے، جس نے اُن کی ذات کو دل آویز شخصیت بنا دیا تھا، گویا وہ فطرت کا تراشیدہ ایسا ہیرا تھے جس کا ہر پہلو حسن و جمال اور رنگ ونور کا جاذبِ نظر منظر پیش کرتا تھا۔ اُن کی ذات میں علم کے ساتھ عمل، حسب ونسب کی بلندی کے ساتھ تواضع، نظافت کے ساتھ سلیقہ، اِصابتِ رائے کے ساتھ خود اعتمادی، فقر کے ساتھ توکل، غنائے نفس اور سیر چشمی، سخاوت، شجاعت اور شمع کی طرح اپنا نقصان کرکے دوسروں کے لیے ماحول کو منور کرنے جیسے اوصاف تھے۔'' (کلیات کاشف، ص ۲۸-۲۹)

اُن کی سراپا نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمھیں شعر وسخن کا ذوق ہے، چلو تمھیں ایک باکمال شاعر سے ملا دیں۔ یہ شاعر ہیں حضرت کاشف الہاشمی، نکھرا ہوا رنگ، بلند پیشانی، سنہرے چشمے کے اِحسانات سے گراں بار بڑی بڑی آنکھیں، نکلتا ہوا قد، ذہانت کا پیکرِ جمیل، بیٹھیں تو کوہِ گراں کی نشست، چلیں تو ڈھال سے اُترتے ہوئے محسوس ہوں، یہی ہیں مملکتِ شعر وسخن کے خاموش تاج دار، اس فن میں

تلمّذ کسی سے نہیں؛ مگر ذرّوں کو ہاتھ لگادیں تو وہ ستارے بن کر چمکنے لگیں، اُن کو ترتیب سے رکھ دیں تو کہکشاں کی تصویر اُبھر آئے، مضامین اُن کے سامنے خود گرفتاری کی پیش کش کریں اور الفاظ موتیوں کی لڑی بن کر اُن کے قلم سے بکھرنے میں فخر سمجھیں۔'' (پیش لفظ ''واردات'' ازمولانا عبدالجلیل راغبی، ص۸)

مولاناؒ کو نثر ہی کی طرح نظم میں بھی زبردست قدرت تھی، وہ نہ صرف خوش گو شاعر تھے؛ بل کہ اُن کی شاعری میں استادانہ پختگی اور اَصالت تھی۔ اس فن میں اُن کے استاذ مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی (۱۳۵۱ھ/۱۹۳۳ء = ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء) تھے، جو دیوبند کے پڑوس میں واقع گاؤں ''راجو پور'' کے باسی تھے اور جن کے تفسیری سلسلے ''ہدایت القرآن'' کو بڑی شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی۔ مولانا کاشفؒ صاحبِ بصیرت عالم، صاحبِ طرز نثر نگار اور صاحبِ اِدارک شاعر تھے۔ اُن کے کلام میں علامہ اقبالؒ (۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء = ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) کا سا رنگ وآہنگ پایا جاتا ہے، اُنھی کی طرح کائنات کو اصلاً مومن کی میراث سمجھتے تھے اور خودی اور فقرِ غیور کی پرورش پر توجّہ کی مسلمانوں کو دعوت دیتے تھے۔

مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری کی شاعری میں اپنے استاذ کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے حمد ونعت بھی کہی ہے اور نظم وغزل بھی، قطعات ومراثی بھی اور مدحیہ قصیدے بھی۔ اُن کی شاعری میں عالمانہ وقار، استادانہ شکوہ، ماہرانہ نکتہ آفرینی، کے ساتھ ساتھ مومنانہ سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ غزل گوئی میں انھوں نے اصغرؔ گونڈوی (۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء = ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء) کا تتبع بھی کیا ہے، ایک آدھ غزل میں میرتقی میرؔ (۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء = ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کا انداز بھی نظر آتا ہے، جگرؔ مرادآبادی (۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء = ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء) تو ہر شعروادب کا مذاقِ لطیف رکھنے والے کے محبوب رہے ہیں، تو مولاناؒ جیسے زبان کے اداشناس کے کیوں نہ ہوتے۔

ظفرؔ بجنوری کے یہاں بہت سے ان مضامین میں بھی ندرت کا رنگ بہت شوخ ہے، جنھیں اساتذۂ سُخن نے بھی اپنے رنگ میں اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ مثلاً غم کو انگیز کرنا؛ بل کہ اس کو متاعِ زیست خیال کرنا کے مضمون کو بہت سے شعرا نے اپنے شعر میں نظم کیا ہے۔ غالبؔ (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء = ۱۲۸۵/۱۸۶۹ء) کا شعر تو ضرب المثل ہے:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

اور

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شاعر دردؔ کلیم عاجزؔ پٹنوی (۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء = ۱۴۳۶ھ/۲۰۱۵ء) نے غالبؔ سے بہت آگے کی بات کہہ دی ہے، جس سے عیاں ہوتا ہے کہ غم کے بغیر زندگی جینی دشوار ہے:

غم تو متاعِ زیست ہے، اُس سے گریز کیا
جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے

ظفرؔ بجنوری کے یہاں یہ مضمون اورخوبی و بانکپن سے اِس طرح ادا ہوا ہے کہ اس سے غم کے نہ صرف قیمتی اثاثہ ہونے کا تصور جاگزیں ہوتا ہے؛ بل کہ اس کے مقدس و پاکیزہ پونجی ہونے کا اعتقاد راسخ ہوتا ہے اور یہ ایمان پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایسا عطاے الٰہی ہے، جس سے باری تعالیٰ اپنے خاص بندوں ہی کو نوازتا ہے:

متاعِ غم، عطاے خاص ہے، سجدے کے دیوانے!
یہ دولت اُس کو دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

انسان خطا کار ہے، بہت احتیاط کے باوجود، اس سے بہت سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں؛ لیکن بہت سے خدا کے بندے بڑے رجائیت پسند ہوتے ہیں، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ غفور رحیم ہے، وہ ہمارے اور دیگر بندوں کے سارے گناہ معاف کردے گا۔ بہت سے خدا کے بندے یہ خیال کرتے ہیں کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم شافعِ محشر ہیں، اِس لیے ہمارے گناہ کے انبار ان شاء اللہ آپ ﷺ کی شفاعت سے بخش دیے جائیں گے۔ اِس مضمون کو عربی زبان میں علامہ بوصیریؒ (ابوعبداللہ شرف الدین محمد بن سعید بن حماد بن عبداللہ صنہاجی بوصیری مصری ۶۰۹ھ/۱۲۱۲ء =۶۹۶ھ/۱۲۹۵ء) نے قصیدۂ بردہ کے ایک شعر میں بہت البیلے اور رقت آمیز انداز میں بیان کیا ہے، ہر باشعور مسلمان اس کو پڑھتے وقت بے طرح جذبات سے سرشار ہوجاتا ہے۔ شعر یہ ہے:

لَعَلَّ رَحْمَةَ رَبِّي حِينَ يَقْسِمُهَا
تَأْتِي عَلَىٰ حَسَبِ الْعِصْيَانِ فِيْ الْقِسَمِ

(امید ہے کہ میرے پروردگار کی رحمت، جب وہ اُس کو اپنے بندوں میں تقسیم کرے گا، بہ قدر گناہ حصوں میں آئے گی) یعنی جتنے گناہ زائد ہوں گے، اُسی قدر رحمتِ الٰہی زائد ہوگی۔

فارسی کے ایک شاعر نے اِسی مضمون کو اِس طرح ادا کیا ہے، جس میں ناز وانداز کا رنگ غالب تو ہے؛ لیکن علامہ بوصیری والی رقت انگیزی اور جگر سوزی نہیں ہے:

پیشِ عفوش قلتِ تقصیرِ ماست
عفوِ بے اندازہ می خواہد گناہِ بے حساب

(اُس کے درگزر کے سامنے میرا گناہ معمولی ہے، حق تعالیٰ کی بے انتہا مغفرت ہمارے بے شمار گناہ کی متقاضی ہے)

دوسرے فارسی شاعر نے رجائیت کی حدوں کو عبور کرتے ہوے یہ تک کہہ دیا ہے:

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہ گارا نند

(اے خداشناس چلو ہٹو! ہماری قسمت میں جنت ہے؛ کیوں کہ خدا کے کرم کا استحقاق گنہ گاروں کو ہے، ہم چوں کہ گنہ گار ہیں؛ اس لیے ہمیں جنت ضرور ملے گی، تمھارا کیا حال ہوگا وہ خدا ہی کو معلوم ہے)

اصغرؔ گونڈویؒ نے اس مضمون کو اردو زبان کے خوب صورت پیرایے میں اس طرح پرویا ہے:

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

اصغرؔ نے ''متاعِ ذوقِ عصیاں'' کی انوکھی ترکیب سے اِس شعر کو غیر معمولی جاذبیت عطا کی ہے؛ لیکن اس میں ایک بڑی کمی یہ درآئی ہے کہ ''بے تابی'' کی نسبت خداے بے نیاز کی طرف ہوگئی ہے، بے تابی اضطرار کا نتیجہ ہوتی ہے، جس سے خداے ذوالجلال مُنَزَّہ ہے۔

مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری نے اِس مضمون کو اِس خوبی سے ادا کیا ہے کہ اس میں اسلامی عقیدے کے اعتبار سے کوئی نقص ہے نہ زبان و بیان کی سلاست و نزاکت کے لحاظ سے:

کرم کے ساتھ لامحدود رکھیں لغزشیں ہم نے
بہ قدرِ ظرف کیا رکھتے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

شاعرِ باشعور نے یہاں ''لغزشیں'' کا لفظ بہت برمحل استعمال کیا ہے؛ کیوں کہ ''لغزش'' اُس خطا کو کہتے ہیں جو سہواً ہو جاتی ہے یا بے شعوری میں انسان سے سرزد ہوا کرتی ہے۔ گویا شاعر نے اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی سے امید کے ساتھ اور خدا کی رحمت و مغفرت کے یقین کے باوجود بالقصد گناہوں سے بچنے کی تلقین بھی کی ہے اور اللہ کی رحمت کے بھروسے ڈھٹائی اور اصرار کے ساتھ

معاصی کے بالارادہ ارتکاب سے احتراز کا درس بھی دیا ہے۔

بہ ہر کیف یہ شان دار مضمون ہے جسے مسلمان شعرا نے ہر زبان میں نظم کیا ہے۔ بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدّس سرّہ العزیز (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء = ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) نے اپنے نعتیہ اردو قصیدے میں کثرتِ گناہ کے باوجود مغفرت سے بہرہ وری کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا ثمرہ باور کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ سُن کے آپؐ شفیعِ گناہ گاراں ہیں
کیے ہیں میں نے اِکھٹے گناہ کے انبار

ظفرؔ بجنوری کے کلام میں ایک ندرت یہ بھی ہے کہ شعر کی کوئی بھی صنف ہو، رنگ تغزّل کبھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ترانۂ دارالعلوم میں بھی (جواُن کی شاعرانہ فن کاری، بلند آہنگی اور الہامِ شعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور جس میں اُنھوں نے دارالعلوم کی تاسیس کے پس منظر، تاریخ، کارناموں کے تذکرے ساتھ ساتھ اُن اشخاص کے ناموں کی تلمیحات کو سبک روی کے ساتھ استعمال کیا ہے، جو دارالعلوم کے تاریخی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں) تغزل کا رنگ خاصا شوخ اور نکھرا ہوا ہے، مثلاً یہ اشعار پڑھیے:

خود ساقیِ کوثر نے رکھی، مَے خانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے، دیوانوں کی رُوداد یہاں
برسا ہے یہاں وہ ابرِ کرم، اٹھا تھا جو سوئے یثرب سے
اِس وادی کا سارا دامن سیراب ہے، جوئے یثرب سے
کہسار یہاں دب جاتے ہیں، طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اِس کاخِ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں
مہتاب یہاں کے ذرّوں کو، ہر رات منانے آتا ہے
خورشید یہاں کے غنچوں کو، ہر صبح جگانے آتا ہے
یہ صحنِ چمن ہے برکھا رُت، ہر موسم ہے برسات یہاں
گل بانگِ سحر بن جاتی ہے، ساون کی اندھیری رات یہاں
اسلام کے اِس مرکز سے ہوئی، تقدیس عیاں آزادی کی
اِس بامِ حرم سے گونجی ہے، سوبار اذاں آزادی کی

جو شمعِ یقیں روشن ہے یہاں، وہ شمعِ حرم کا پرتو ہے
اس بزمِ ولیؒ اللٰہی میں، تنویرِ نبوت کی ضَو ہے
یہ مجلسِ مَے وہ مجلس ہے، خود فطرت جس کی قاسم ہے
اِس بزم کا ساقی کیا کہیے، جو صبحِ ازل سے قائم ہے
رومی کی غزل، رازی کی نظر، غزالی کی تلقین یہاں
روشن ہے جمالِ انور سے، پیمانۂ فخرالدین یہاں
اِس بزمِ جنوں کے دیوانے، ہر راہ سے پہنچے یزداں تک
ہیں عام ہمارے افسانے، دیوارِ چمن سے زنداں تک
سو بار سنوارا ہے ہم نے، اس ملک کے گیسوئے برہم کو
یہ اہلِ جنوں بتلائیں گے، کیا ہم نے دیا ہے عالم کو
جو صبحِ ازل میں گونجی تھی، فطرت کی وہی آواز ہیں ہم
پروردۂ خوشبو غنچے ہیں، گلشن کے لیے اِعجاز ہیں ہم

مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کے کلام کا مجموعہ ''نغمۂ سحر'' کے نام سے پہلی بار ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ کتاب کے شروع میں، اُن کے برادرِ نسبتی مولانا لقمان الحق فاروقی مرحوم کا مفصل مبصرانہ، ادیبانہ اور محققانہ مقدمہ ہے، جس میں شرح وبسط کے ساتھ، اُن کی شاعری کا مطالعہ کیا گیا ہے اور اُن کے شعر کی روح کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ساتھ ہی ان کا مختصر سوانحی خاکہ بھی نذرِ قارئین کیا گیا ہے۔ ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء کے اڈیشن میں اُن کے دوسرے برادرِ نسبتی مولانا برہان الحق صاحب فاروقی زید مجدہ کے قلم سے ضمیمۂ احوال کا اِضافہ ہے، جس میں اُن کا مزید احوال درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا ظفر بجنوریؒ نے اپنے قلمِ اِعجاز رقم سے اپنے شفیق ومربی بھائی اور شعر وسخن کے باب میں اپنے استاذ مولانا محمد عثمان متخلص بہ ''کاشف'' کی ''حضرت کاشف الہاشمی'' کے عنوان سے سوانح لکھی ہے، جس میں اُن کے ضروری حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اُن کے شعری محاسن، تخیلات کی بلندی اور قلندرانہ زندگی پر روشنی ڈالی ہے، جو چشم کشا بھی ہے اور بصیرت افروز بھی اور جس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہماری گدڑیوں میں کیسے کیسے لعل چھپے رہے ہیں، جن کی ہماری کم نگاہی کی وجہ سے وقت رہتے ہوئے قدر نہ کی جا سکی اور وقت کے بعد سوائے حسرت ویاس کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس کے بعد دیوان کی ابتدا دعا سے کی گئی ہے،اس کے بعد تین نعتیں درج ہوئی ہیں، پھر''عازم بیت اللہ کے نام'' کے عنوان سے ایک نظم پیش کی گئی ہے جو قدرے طویل ہے، پھر حضرت نانوتوی نوراللہ مرقدہ کی نعتِ فارسی کا اردو ترجمہ شعر میں صاحبِ دیوان نے پیش کیا ہے، پھر غزلوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے جو ص ۵۵ سے شروع ہوکر ص ۱۰۰ پر ختم ہوا ہے،غزلوں کے آخر میں ایک غزل میرؔ کے تتبع میں اور چار غزلیں اصغرؔ کے تتبع میں کہی گئی، شائع کی گئی ہیں۔ص ۱۰۱ سے نظموں اور مراثی وقطعات کا سلسلہ ہے جو ترانۂ دارالعلوم ص ۱۰۲ سے شروع ہوکر، ص ۱۳۳ پر شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء =۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) کے مرثیے پر ختم ہوا ہے۔اس کے بعد مسک الختام کے طور پر کاشفؔ الہاشمی صاحب کی بعض نظمیں شائع کی گئی ہیں، جن میں ''فرشتہ اور انسان'' اور ''رنگا رنگ: زندگی کی مختلف تعبیریں'' اور ''حسن وعشق'' شامل ہیں۔

غالب نے کہا تھا:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اس وقت ہر کس وناکس شاعری کرنے، یعنی اس کی آبرو کو پامال کرنے لگا ہے؛ اِس لیے حضرت ظفرؔ بجنوری کے دیوان ''نغمۂ سحر'' اور اُن کے عظیم استاذ کاشف الہاشمی کے دیوان ''کلیاتِ کاشف'' (جو ظفر بجنوری کی نگرانی میں مولانا اشتیاق احمد قاسمی دربھنگوی استاذ دارالعلوم دیوبند نے حواشی سے مزین کرکے ترتیب دے کر ابھی حال ہی میں، یعنی ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰۱۶ء میں شائع کیا ہے) کا مطالعہ زبان وبیان کا مذاق رکھنے والے، ہر انسان کو کرتے رہنا چاہیے؛ تاکہ وہ نسلِ نو کو یہ بتا سکے کہ

بہت جی خوش ہوا حالؔی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

مولاناؒ کا ایک نمایاں وصف اُن کی سخاوت وفیاضی اور مہمان نوازی تھا۔وہ تقریباً ۲۲-۲۳ برس تک ہمارے پڑوسی رہے۔افریقی منزل قدیم نزد چھتہ مسجد میں وہ زیریں منزل کے مکین تھے اور راقم بالائی منزل کا، وہ اکثر راقم کے متعلق مجلسوں میں مزاحاً فرماتے کہ ''مولانا نور عالم میرے سرپرست ہیں، یعنی میرے سر پر رہتے ہیں، میں اِن کی سرپرستی میں رہتا ہوں، خواہ یہ سرپرستی قبول کریں یا نہ کریں۔''

راقم دیکھتا تھا کہ اُن کے یہاں روزانہ خواہ ناشتے میں، خواہ دوپہر یا رات کے کھانے میں ایک

دو یا چند مہمان ضرور ہوتے تھے، عصر بعد کی مجلس میں دس بیس آدمی یا اس سے زائد بندے آشریک ہوتے اور وہ ہر ایک کو چائے اور کبھی اُس کے ساتھ وائے ضرور پیش فرماتے۔ رمضان کے دنوں میں یہ سلسلہ اور بڑھ جاتا تھا، مولاناؒ کے یہاں سے ہم سارے پڑوسیوں کے یہاں انواع واقسام کی افطاریوں سے سجا ہوا خوانِ یغما مہینے میں کئی بار ضرور آتا۔ ۲۰-۲۲ برس کی مُجاوَرَت کے بعد جب وہ اپنے نئے تعمیر شدہ مکان واقع محلّہ خانقاہ منتقل ہوگئے، تب بھی کئی سال تک اُنھوں نے اِس سلسلے کو باقی رکھا۔ پھر ہم ہی لوگوں کے دباؤ میں کہ اب جائے وقوع کی قدرے دوری ہوگئی ہے اور جو بچے ماکولاتی ہدیوں کی ترسیل کا کام کرتے تھے وہ بڑے ہوکر اب بہت مشغول ہوگئے ہیں؛ اِس لیے اب یہ سلسلہ موقوف کردیا جائے تو ہم لوگوں کو بے حد خوشی ہوگی، مولاناؒ بہ مشکل تمام اس کو موقوف کرنے پر راضی ہوے؛ لیکن اُنھوں نے ہم پڑوسیوں کو اور ہم پڑوسیوں نے اُنھیں ہمیشہ رشتہ دار اور عزیز ہی باور کیا اور خوشی وغم میں ہم ایک دوسرے کے برابر شریک رہے۔ مولاناؒ کے یہاں یا ہمارے ہاں کوئی تقریب ہوتی تو ہم ایک دوسرے کو ضرور مدعو کرتے؛ لیکن مولانا اور اُن کی اہلیہ (صفیہ شاہانہ ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء =۱۴۳۲ھ/۲۰۱۱ء) کی طرف سے ہمارے ساتھ جود وکرم کا معاملہ ہم سے سوا ہوتا۔

مولاناؒ مفلوک الحال کی مدد کرتے اور دردمندوں کا درد بانٹتے تھے، کسی کو کسی بات پر سرزنش کرتے تو بڑے پیار سے اِس انداز میں کرتے کہ کبھی مخاطب کو بُرا نہ لگتا۔ وہ کسی کو سخت بات بھی کہتے تو استعارہ اور رمزیت کا ایسا خوب صورت پیرایۂ بیان اور دل کش گفتگو کا ایسا انداز اختیار کرتے کہ بات کی تلخی نہ صرف کافور ہوجاتی؛ بل کہ وہ قَندِ مُکرَّر بن جاتی۔

وہ اسلاف اور اکابر کے مسلک ومشرب کی سختی سے پیروی کرتے، اس سے ذرہ برابر انحراف کو ناروا تصور کرتے۔ نماز باجماعت کے بہت پابند تھے۔ اُن کی کبھی کوئی نماز قضا ہوئی نہ روزہ۔ قرآنِ پاک کی تلاوت کا خاص اہتمام فرماتے۔ مسائل کے باب میں جمہور علماے احناف کی رائے اور فتویٰ پر عمل کرتے، بہت سے علما کی طرح اس سلسلے میں وہ کسی تفرد کے قائل نہ تھے۔ بالعموم مشورے کی پابندی کرتے، پھر جو رائے قائم کرتے اُس پر کوہِ گراں کی طرح جمے رہتے۔ اُن کی زندگی میں تذبذب اور انتشار کا کوئی گزر نہ تھا۔ اعتدال، تواضع، سادگی، اتّباعِ سنت، یک رنگی، فکری پختگی، یقینِ محکم؛ معرکۂ حیات میں اُن کی کارگر شمشیریں تھیں۔

مولاناؒ علمی لیاقت کے بہ قدر متنوع مشاغلِ زندگانی کی وجہ سے، تصنیف وتالیف کی طرف کما حَقُّہ تَوَجُّہ نہ دے سکے؛ ورنہ وہ ایک بڑے مُؤَلِّف اور اہلِ قلم ہوتے؛ لیکن جو تالیفی وتحریری کام اُنھوں

نے کیے وہ بہت گراں مایہ ہیں، جن میں سرِ فہرست اُن کی صحیح بخاری کی شرح ''ایضاح البخاری'' ہے، جس کی اب تک دس جلدیں آچکی ہیں۔ اِس کتاب میں اصلاً تو اُنھوں نے اپنے جلیل القدر استاذ ودارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد قدّسَ سرُّہ (۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء =۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء) کے اِفادات کو جمع کیا ہے، جنھیں اُنھوں نے زمانۂ طالب علمی میں پابندی سے نوٹ کیا تھا؛ لیکن اُنھوں نے بخاری کی اِس شرح کو مفید تر اور دیگر شرحوں سے ممتاز تر بنانے کے لیے خود بھی سابقہ شرحوں اور علماے دیوبند کے افادات کا مطالعہ کرنے کا التزام کیا، اِسی لیے کام خاص تحقیقی اور دراز نفس ہوگیا، اس کی وجہ سے اُن کے مشغول اوقات کا بڑا سرمایہ اس میں صرف ہوگیا۔ اُن کا مزاج بہت سے اہلِ علم ونظر کی طرح یہ تھا کہ کوئی کام یا تو کیا نہ جائے اور اگر کیا جائے تو ایسا ہو کہ وہ ہر اعتبار سے بہتر سے بہتر ہو کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور یہ کہیں کہ کام اِسے کہتے ہیں؛ اِسی لیے وہ اپنے فکر ونظر کا بہت بڑا اثاثہ خرچ کرکے کتاب کی صرف پانچ جلدیں ہی تیار اور شائع کرسکے، اس دوران بڑھاپا اور اُس کے بڑھتے ہوئے عوارض اور طرح طرح کی بیماریوں کی وجہ سے وہ بہت ٹوٹ چکے تھے اور اُن کو اندازہ تھا کہ اب یہ کام اُن سے موجودہ ضعفِ جسمانی اور فکری ناتوانی کے ساتھ اُن کے قائم کردہ معیار پر نہیں ہوسکتا تو اُنھوں نے چند سال قبل ہی اِس سلسلے میں اپنے ذی استعداد تلمیذ رشید مولانا فہیم الدین بجنوری قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند کو اس کام میں اپنا معاون بنالیا اور اُنھیں منہج کار بتا کر اپنی براہِ راست نگرانی میں اِس کام کو جاری رکھا؛ چناں چہ اُن کی حیات ہی میں اس کتاب کی دسویں جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر بازار میں آچکی تھی۔ ان شاء اللہ اُن کے بعد بھی یہ کام حسبِ سابق اُن کے نقشۂ راہ کے مطابق جاری رہے گا اور کتاب تقریباً ۲۲ جلدوں میں اِن شاء اللہ مکمل ہوجائے گی۔

اِس کتاب کی خصوصیت- جو اس کو بخاری شریف کی ساری شرحوں سے ممتاز کرتی ہے- یہ ہے کہ اِس میں اِفاداتِ اکابر کا اِحاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یعنی اگر بخاری کی حدیثوں کے حوالے سے کوئی بات اُنھوں نے کہی ہے تو اُس کو اپنی جگہ درج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اِس سے استفادے میں بے انتہا آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری کے تراجم کی گہرائیوں میں اتر کر اُن کی قدر و قیمت اجاگر کی گئی ہے اور اُن کی اصل حقیقت ومراد کو واضح کیا گیا ہے؛ کیوں کہ مولانا مرحوم کے استاذِ کبیر حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب نوَّرَ اللہ مرقدہ، جن کے اِفادات کو ''اِیضاح البخاری'' میں جمع کیا گیا ہے، بخاری کے تراجم کے اصل مطالب تک پہنچنے میں فرد تھے۔ بہت سے

دقیق النظر علما اُنھیں اِس حوالے سے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (احمد بن علی ابوالفضل متوفی ۸۵۲ھ/ ۱۴۴۹ء) صاحب ''فتح الباری'' سے فائق قرار دیتے ہیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری (محمد بن اسماعیل جعفی ۱۹۴ھ/۸۱۰=۲۵۶ھ/۸۷۰ء) نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (نعمان بن ثابت ۸۰ھ/۶۹۹ء =۱۵۰ھ/۷۶۷ء) پر جتنے اعتراضات کیے ہیں، اُن کا مدلل اور بھرپور جواب دیا گیا ہے اور ایسے مواقع کی بحثوں کو سارے گوشوں کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے؛ تاکہ ان اعتراضات سے پیدا شدہ الجھن کے شکار علما وطلبہ کو مکمل تشفی ہوجائے، اُنھیں کسی طرح کی تشنگی محسوس نہ ہو۔

اُن کی دوسری اہم کتاب ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' ہے، جو اُنھی کی نگرانی میں ''شیخ الہند اکیڈمی'' دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی، جس کے وہ ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۷ء سے مدیر مقرر ہوے اور کئی سال تک یہ ذمّے داری بہ حسن وخوبی انجام دی، اُن کی اِدارت اور نگرانی میں اکیڈمی سے کئی اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' کی تالیف کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۴۰۰-۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۰-۱۹۸۲ء کے دوران دارالعلوم میں جو انتشار کی حالت پیدا ہوئی، جس میں شوریٰ کی حیثیت کو کم زور کرنے کی کوشش کی گئی، اس پس منظر میں حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی قُدِّسَ سِرُّہٗ (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۱۱ء =۱۴۱۳ھ/ ۱۹۹۲ء) کا ایک رسالہ ''رسالۂ اہتمام وشوریٰ'' منظرِ عام پر آیا، جس میں مہتمم کو اصل اور شوریٰ کو فرع قرار دیا گیا اور دارالعلوم کے دستورِ اساسی کو غیر شرعی بتایا گیا تھا۔ حضرت مولانا چوں کہ حضرت اقدس حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نَوَّرَ اللہُ مرقدَہٗ (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء =۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) کے خلیفۂ مجاز اور علم وعرفان کے حوالے سے بڑے مقام کے آدمی تھے؛ اِس لیے اُن کی طرف سے دارالعلوم کے دستورِ اساسی پر اعتراض کو علمی حلقوں میں باوزن گردانا گیا۔ اِس صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر دارالعلوم کے صدرالمدرسین حضرت مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء =۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۱ء) نے شوریٰ کے موضوع کی تحقیق وتنقیح کے لیے مولانا ریاست علی مرحوم کو مُکلَّف فرمایا، مولاناؒ نے موضوع کے سارے مصادر ومراجع کا مطالعہ کیا اور ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' میں اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش فرمایا اور دارالعلوم کے دستورِ اساسی کے غیر شرعی ہونے کے شبہے کی تردید مضبوط دلائل کی روشنی میں کی۔

اِدھر چند سالوں سے وہ صحت کی ناسازی کے باوجود کئی ایک گراں مایہ علمی وتحقیقی کاموں میں لگے رہے؛ جن میں قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ (متوفی بعد ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء) کی کتاب ''کشّافُ اصطلاحات الفنون'' کی تحقیق اور اصل نسخے یعنی مصنف کے قلم سے لکھے ہوے اصل مخطوطہ مسودے سے مقابلہ

اور انتہائی تدقیق کے بعد کتاب کے صحیح اور مُحقَّق نسخے کی تیاری بھی ہے۔ اُنھوں نے اس زبردست تحقیقی کام میں اپنے کئی ایک فاضل تلامذہ سے بھی مدد لی اور اپنی زندگی ہی میں وفات سے کچھ مدت پہلے کتاب کو کمپیوٹر سے ٹائپ کروا کر مبیضے کی تصحیح وغیرہ سے فارغ ہوگئے تھے اور اب صرف اس کتاب کی اشاعت رہ گئی ہے جو ہونے کو ہے۔

خوش قسمتی سے مولاناؒ کو اِس کتاب کے مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قلمی مخطوطے کا عکس، مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری سے مل گیا، نیز کتاب کے قدیم ایڈیشن مطبوعہ کلکتہ (جو ۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۲ء قسط وار شائع ہوا تھا اور جس کا عکس سہیل اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۳ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء =۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) کی ہدایت کے مطابق طبع کیا تھا جس کے نسخے بازار میں دست یاب ہیں) کا نسخہ اُنھیں بہ آسانی مل گیا، نیز عالم عربی سے طبع شدہ کتاب کا وہ ایڈیشن بھی مل گیا جو الف بائی ترتیب سے شائع ہوا ہے؛ کیوں کہ مصنفؒ کے یہاں الف بائی ترتیب نہ تھی؛ بل کہ اُنھوں نے پہلے حرف کو باب اور تیسرے حرف کو فصل قرار دے کر الفاظ اور اصطلاحات لکھے تھے، مثلاً ''ادب'' کا لفظ باب الألف فصل الباء میں تھا۔ مولاناؒ نے اِن تینوں نسخوں کو بنیاد بنا کر کتاب کا ممکنہ حد تک صحیح ترین اور مکمل نسخہ تیار کیا ہے اور کتاب کو عصرِ جدید کے مذاق کے مطابق مُدَوَّن کر کے اس کو مفید تر بنا دیا ہے۔ اُنھوں نے مندرجۂ ذیل اہم کام کیے ہیں:

۱- مصنفؒ نے جن اصطلاحات کی تعریف میں فارسی زبان کا استعمال کیا ہے، اس کو کتاب کے متن میں اُسی طرح باقی رکھنے کا التزام کیا گیا ہے؛ تاکہ فارسی جاننے والے اہلِ علم بہ راہ راست استفادہ کرسکیں۔

۲- فارسی متن کے نیچے عربی ترجمہ بھی درج کیا گیا ہے، اگر ترجمے میں کوئی غلطی درآئی تھی تو حتی الاِمکان اُس کی تصحیح کردی گئی ہے؛ تاکہ فارسی سے ناواقف لوگ عربی ترجمے سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

۳- اگر مصنفؒ نے کسی فارسی متن کا عربی ترجمہ نہیں کیا تھا تو اِس مُحقَّق نسخے میں فحص وتدقیق کے ساتھ عربی ترجمے کا اِضافہ کیا گیا ہے۔

۴- متن کی عبارت کو، عصرِ حاضر میں رائج رموزِ املا اور علاماتِ ترقیم کے مطابق لکھا گیا ہے؛ تاکہ موجودہ زمانے کے قاری کو کتاب سے استفادے میں کوئی تکلف نہ ہو۔

۵- آیاتِ قرآنی اور احادیث کی تخریج کی گئی ہے۔

۶- ضروری الفاظ کو بااعراب لکھا گیا ہے۔

۷- پوری کتاب کی عبارت کی دقتِ نظری کے ساتھ تصحیح کی گئی ہے؛ کیوں کہ اِس طرح کی خالص علمی وفنی کتاب میں ذراسی غلطی بھی، بڑی علمی گم راہی پر منتج ہوتی ہے۔

دوسرا اہم علمی وتحقیقی کارنامہ مولانا نے یہ انجام دیا کہ مولانا فتح محمد تائب لکھنوی (متوفی ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء) کی ''خلاصۃ التفاسیر'' کی تدوین وتحقیق کی اوراس سلسلے میں اپنے بعض ہونہار شاگردوں سے مدد لی۔ اِس تفسیر کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ اس کی زبان میں سادگی اور ایجاز ہے اوراپنے نام کے مطابق واقعتاً بہت سی تفسیروں کی روح ہے۔ترجمے میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء =۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء =۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) کے تراجم سے استفادے کا اہتمام کیا ہے، ترجمے میں محاورہ اور لفظ دونوں کا خیال رکھا گیا ہے، احکام کے باب میں مشہور ومقبول روایات درج کرنے کی پابندی کی گئی ہے؛ جب کہ ترغیب وترہیب کے سلسلے میں وہ روایات لی گئی ہیں جو کسی معتبر کتاب میں وارد ہوئی تھیں اوراُن کا مضمون کسی امر ثابت اور خبرِ صحیح کے مخالف نہ تھا، آیاتِ قرآنی سے دقیق لطائف بھی اخذ کیے ہیں، اَصحابِ تزکیہ واِحسان کا بھی جامعیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، اسرائیلیات میں سے صرف وہ روایات لی ہیں جو انبیا کی عصمت، عقلِ صحیح، اخبارِ صحیحہ اور اصولِ اسلامی کے مخالف نہ تھیں، مسائلِ فقہیہ کو احناف کی قابلِ اعتماد کتابوں اور مصادر سے نقل کرنے کی کوشش کی ہے، تفسیر میں بھی حنفی اصول کو ہی ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء =۱۳۹۹ھ/۱۹۷۸ء) کو بھی یہ تفسیر بہت پسند تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ تفسیر ہٰذا ''بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر'' کی مصداق ہے۔ یہ تفسیر سب سے پہلے لکھنؤ کے مطبع انوارِ محمدی سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء سے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء کے درمیان شائع ہوئی، جو چار جلدوں پر مشتمل تھی، صفحات کی تعداد ۲۶۴۰ تھی۔ بعد میں یہ نایاب اور غیر مُتَدَاوَل ہوگئی تھی۔

مولاناؒ کو اِس کا ایک مطبوعہ بوسیدہ نسخہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے سے ملا؛ چوں کہ وہ اس تفسیر کی مذکور الصدر خوبیوں سے واقف تھے؛ اِس لیے اُنھوں نے تدوین وتحقیق کے بعد اِس کی اِشاعتِ نو کا اِرادہ فرمایا؛ تاکہ طلبہ وعلما کو اِس مختصر اور غیر معمولی تفسیر سے استفادے کا موقع ملے اور دسیوں کتابوں کا خلاصہ اُنھیں اِسی ایک کتاب میں مل جائے۔

اِس کتاب کی تدوینِ نو اور تحقیق میں مولاناؒ نے مندرجۂ ذیل کام کیے اور کرائے ہیں:

۱- احادیثِ مرفوعہ کی تخریج صحیحین سے کی گئی ہے، اگر کوئی روایت صحیحین میں نہیں ملی تو دیگر

کتبِ سنن ومسانید کا حوالہ دیا گیا ہے۔

۲-حوالے میں احادیث کے نمبروں کے علاوہ کتاب، باب اور مطبع کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

۳- اقوالِ صحابہؓ کا حوالہ کتبِ حدیث سے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتبِ حدیث میں اگر حوالہ نہیں ملا تو کتبِ تفسیر کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

۴-مصنفؒ نے حوالوں کے لیے جن کتابوں کو بنیاد بنایا ہے، اُن سے بہ راہِ راست مراجعت کی گئی ہے اور عصری انداز میں حوالوں کی تجدید کردی گئی ہے۔

۵-مصنف کی عبارتوں میں ضروری جگہوں پر عناوین کا اِضافہ کیا گیا ہے۔

۶-تدوینِ نو میں عصری انداز میں رموز اِملا کا استعمال کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۷-صفحات کے نیچے جو حواشی اور حوالے مصنف کے ہیں، اُن کے آخر میں ''منہ'' لکھ دیا گیا ہے، جب کہ محقق نے اپنے حواشی کو مطلق رہنے دیا ہے۔

سوانحی خاکہ

مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری ۹؍مارچ ۱۹۴۰ء (شنبہ: ۲۸؍محرم ۱۳۵۹ھ) کو شہر علی گڑھ کے محلّہ ''حکیم سرائے'' میں پیدا ہوے۔ یہاں اُن کے والد ماجد جناب منشی فراست علیؒ (متوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) درس وتدریس کے مشغلے کی وجہ سے مقیم تھے۔ آبائی وطن موضع ''حبیب والا'' ضلع بجنور ہے۔ حبیب والا ضلع بجنور کی قدیم آبادیوں میں سے ایک ہے، اس کی تاریخ تاسیس ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء ہے جو ''حبیب والہ'' کے لفظ سے نکلتی ہے، گویا یہ نام اُس بستی کا تاریخی نام ہے۔ یہ بستی اُن تین بستیوں میں سے ایک ہے جو مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر (۹۴۹ھ/۱۵۴۲ھ = ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) نے میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ (خالد بن زید خزرجی متوفی ۵۲ھ/۶۷۲ء) کی ایک پشتینی اولاد حبیب اللہ (متوفی ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء) کو عطا کی تھیں، جن میں سے ایک ''فیض پور'' ہے جو قصبہ ''نہٹور'' کے قریب ہے، دوسری ''حبیب والا'' ہے اور تیسری ''سرائے شیخ حبیب'' ہے جو قصبہ ''چاند پور'' کے پاس ہے۔

مولانا کا سلسلۂ نسب ۳۵ویں پشت پر سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ شجرۂ نسب اِس طرح ہے:

ریاست علی بن فراست علی بن مشرف علی بن صادق علی بن اصغر علی بن کمال علی بن

مولوی احسان علی بن مولوی محمد امین بن محمد وارث بن عبدالحق بن شیخ سعداللہ بن شیخ عبدالحمید بن شیخ حبیب اللہ بن شیخ خان بن برخوردار بن عبدالکریم بن عبدالخالق بن عبدالرؤف بن شیخ اسعد بن ابوطاہر بن عبدالمالک بن شیخ صادق بن غازی سعداللہ بن خواجہ جلال الدین بن خواجہ سلیم بن خواجہ اسماعیل بن شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ بن خواجہ ابی منصور بن ابی معاذ بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن منصور بن سیدنا ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ۔

مولاناؒ کوئی چار سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مولاناؒ سے بڑے ایک بھائی تھے وراثت علی، متوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء وہ ۱۶؍سال کی عمر میں ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کرکے کم عمری ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مولاناؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ ''حبیب والا'' ہی میں حاصل کی۔ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء میں پرائمری اسکول حبیب والا سے درجۂ چہارم کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اُن کے پھوپا مولانا سلطان الحق صاحبؒ (۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء =۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء) ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند اُنھیں دینی تعلیم میں لگانے کے لیے دیوبند لے آئے۔ مولانا سلطان الحقؒ بڑے دانا مربی اور سیاسی واجتماعی فہم وفراست کے حامل آدمی تھے، کتب خانے میں اُن کے پاس ہمہ وقت دارالعلوم کے اہم اساتذہ وملازمین کی مجلس لگی رہتی تھی، جن اساتذہ وملازمین کو اپنے کاموں سے ذرا فرصت ملتی، مولانا سلطان الحقؒ کی مدبرانہ وتجربہ کارانہ باتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ اُن کے پاس ضرور پہنچ جاتے۔ مولانا سلطان الحق دارالعلوم کے باکمال فضلا میں تھے، حبیب والا ضلع بجنور ہی کے باسی تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۲۹۵ھ/۱۸۷۹ء =۱۳۷۷ھ /۱۹۵۷ء) سے بیعت تھے اور بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ مولانا سلطان الحقؒ نے مولانا ریاست علیؒ کی مکمل تعلیم وتربیت کا معقول انتظام اپنی سرپرستی میں کیا، جس کی وجہ سے اُن کی طالب علمانہ زندگی کا ہرلمحہ اپنے صحیح مصرف میں صرف ہوا۔ دارالعلوم ہی میں مولانا ریاست علیؒ نے فارسی کی تعلیم حاصل کی اور عربی کی ابتدائی کتابیں دارالعلوم کے مختلف اساتذہ سے دارالعلوم میں داخلے کے بغیر پڑھیں۔

۱۸؍شوال ۱۳۷۳ھ = ۱۵؍مئی ۱۹۵۴ء کو بہ عمر ۱۴؍سال دارالعلوم میں شرحِ جامی بحث فعل، کنزالدقائق، اصول الشاشی، قطبی اور نفحۃ العرب کی جماعت میں داخل ہوے۔ محنت، اپنی ذہانت اور اپنے پھوپا مولانا سلطان الحقؒ کی حکیمانہ تربیت کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے درجوں میں ممتاز رہے۔ ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء میں اُنھوں نے دورۂ حدیث شریف کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ لائق ذکر ہے کہ اُس وقت دارالعلوم میں ۵۰ نمبرات آخری نمبرات ہوا کرتے تھے؛

لیکن مولاناؒ کو اُن کے اساتذۂ گرامی نے حد درجہ خوش ہوکر کسی کتاب میں ۵۵، کسی میں ۵۴، کسی میں ۵۳ اور کسی میں ۵۲ نمبر دیے، صرف ایک کتاب میں ۵۰ نمبر ملے۔ سالانہ امتحان میں ہر کتاب میں نمبروں کی تفصیل اِس طرح ہے:

بخاری شریف ۵۵، مسلم شریف ۵۲، ترمذی شریف ۵۲، ابوداؤد شریف ۵۳، نسائی شریف ۵۵، ابن ماجہ شریف ۵۲، طحاوی شریف ۵۳، مُوطّا امام مالک ۵۴، مُوطّا امام محمد ۵۳۔ گویا اُنھیں کل ۵۰۰ نمبرات کی بہ جائے ۵۲۹ نمبرات ملے جو غیر معمولی بات ہے۔

دورۂ حدیث شریف کے سال اُنھوں نے بخاری شریف حضرت مولانا سید فخرالدین احمد نَوَّرَ اللہ مرقدہٗ (۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء =۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء) سے پڑھی، جب کہ مسلم شریف اور ترمذی شریف حضرت علاّمہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء =۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء) سے پڑھیں، ابوداؤد شریف حضرت مولانا سید فخرالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء = ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء) سے، نسائی شریف وابن ماجہ شریف حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) سے، طحاوی شریف حضرت مولانا ظہور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء =۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء) سے، شمائل ترمذی حضرت مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) سے، مُوطّا امام مالک حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء =۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) سے اور مُوطّا امام محمد حضرت مولانا محمد جلیل کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء) اور حضرت مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مشترکہ طور پر پڑھی۔

طالب علمی کے زمانے میں اُنھوں نے جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیبِ کامل کا امتحان فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا؛ چناں چہ ''سرسید گولڈ میڈل'' سے سرفراز کیے گئے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد ہی اُنھوں نے ''اِیضاح البخاری'' کی ترتیب کا کام شروع کر دیا، ذریعۂ معاش کے لیے خوش خطی سیکھی، اِس کے لیے اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ خوش خطی کے صدر مولانا اشتیاق احمد دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) کے سامنے زانوئے تَلَمُّذ تہہ کیا۔ مولانا ریاست علی جلی اور خفی دونوں طرح کی کتابت بہت نفیس کرتے تھے۔ فاؤنٹن پن سے بھی وہ تیز لکھنے کے باوجود ایسا لکھتے تھے کہ اُن کی تحریر موتیوں کی لڑی معلوم ہوتی تھی۔ اِس سلسلے میں بھی دارالعلوم کے اساتذہ میں امتیازی شان کے حامل تھے۔ جو لوگ اہلِ قلم، مصنف اور مضمون نگار ہوتے

ہیں، بالعموم اُن کی تحریریں خوب صورت اور جاذب نظر نہیں ہوتیں؛ لیکن کچھ لوگ مولانا ریاست علیؒ جیسے بھی ہوتے ہیں، جو بولتے ہیں تو موتیاں رولتے ہیں، لکھتے ہیں تو تحریر کے ظاہر و باطن سے قاری کو اسیر بے دام بنا لیتے ہیں۔

تقریباً تین ساڑھے تین سال دہلی میں جمعیۃ علماے ہند میں برسرِعمل رہے۔ آدھی مدت تک الجمعیۃ پریس گلی قاسم جان دہلی کے منیجر رہے اور آدھی مدت الجمعیۃ بک ڈپو واقع جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان کے منیجر کی حیثیت سے کام کیا۔

اس کے بعد اُنھوں نے دیوبند میں کتابت اور دینی کتابوں کی اِشاعت کی خدمت شروع کی۔ ''کاشانۂ رحمت''اور''مکتبہ مجلس قاسم المعارف'' کے نام سے اشاعتی اِدارے قائم کیے، جن سے دیوبند میں پہلی مرتبہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء =۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء) کی ''تاریخِ اسلام''اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری (متوفی ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء) کی''رحمۃ للعالمین'' شائع کی۔ وہ اس زمانے میں لال مسجد دیوبند کے قریب ایک کرایے کے مکان میں رہتے تھے، اسی دور میں راقم کی اُن سے پہلی ملاقات طالب علمی کے زمانے میں، اُن کے ایک قابلِ رشک ہم درس مولانا محمد اُویس القاسمی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ساڑھے نو بجے صبح جمعہ: ۳۰؍ جمادی الاخری ۱۴۱۹ھ = ۲۵؍ستمبر ۱۹۹۸ء) کے برادرِ خُرد مولوی عمیس اختر قاسمی کی معیت میں ہوئی، جو اُن کے پاس اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ مولانا کی خوش اخلاقی اور شیریں کلامی سے بہت محظوظ ہوا۔ اُنھوں نے اِس موقع سے یہ نصیحت بھی کی کہ عزیزم اگر محنت اور لگن سے پڑھنے کا ارادہ ہے تو شہر کے طلبہ سے راہ و رسم نہ بڑھانا؛ ورنہ دارالعلوم کی علمی فضا سے کما حقہ فائدہ نہ اٹھا سکوگے۔ مولانا ریاست علیؒ اپنے رفیق درس مولانا اویس القاسمی سے دلی تعلق رکھتے تھے؛ بل کہ بعض حیثیتوں سے اُنھیں اپنے سے فائق سمجھتے تھے اور اُن کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اُن کے انتقال کے موقع سے وہ خود زیریں منزل افریقی منزل قدیم سے، جہاں اُس وقت اُن کی رہائش تھی، راقم کے پاس بالائی منزل پر تشریف لائے جہاں ہماری اب بھی رہائش ہے اور تعزیت فرمائی کہ وہ میرے پیارے دوست تھے اور بہت سی باتوں میں مجھ سے برتر تھے، چوں کہ وہ تمھارے بھائی ہوتے تھے کہ اُن کے پردادا اور تمھارے پردادا سگے بھائی تھے، اِس لیے میں تم سے دلی تعزیت کرتا ہوں، اللہ اُنھیں غریقِ رحمت کرے اور جنت الفردوس میں ہم سبھوں کو ایک دوسرے سے ملائے۔

اِن ساری مصروفیات کے ساتھ خواہش مند طلبہ کو تطوُّعاً کتابیں پڑھاتے رہے، کچھ عرصہ

مدرسہ اصغریہ دیو بند میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس زمانے میں وہ شاعری بھی کرتے تھے، بہت سے اشعار دوسروں کو لکھ کر دے دیے، کلام کا بہت مُنتخب حصہ ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں ''نغمۂ سحر'' کے نام سے شائع ہوا۔

۱۳۸۳ھ/۱۹۶۴ء میں مولانا سلطان الحقؒ کی صاحب زادی ''صفیہ شاہانہ'' سے اُن کا عقد نکاح ہوا، جن کے بطن سے اُن کے تین صاحب زادے مولانا سفیان قاسمی، مولانا قاری محمد عدنان قاسمی اور مولانا محمد سعدان قاسمی ہیں۔ الحمدللہ ساری اولاد بھی صاحبِ اولاد ہے اور علمی و عملی دنیا میں سرگرم کار ہے۔

۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں دارالعلوم دیو بند میں درجۂ ابتدائی میں تقرر ہوا، ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں وسطی ب میں ترقی دی گئی، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں وسطی الف میں ترقی دی گئی۔ اِن ترقیات کے لیے اُنھوں نے کوئی درخواست نہیں دی؛ بل کہ مجلس شوریٰ نے ازخود لیاقت کی بنیاد پر اُنھیں ترقیات سے نوازا۔

۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں رسالہ ''دارالعلوم'' کا مدیر مسئول مقرر کیا گیا، اُنھوں نے مختلف تدریسی وغیر تدریسی ذمے داریوں کے ساتھ دو سال تک یہ اہم خدمت بہ حسن وخوبی انجام دی۔

۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء میں اُنھیں درجۂ وسطیٰ الف سے درجۂ علیا میں ترقی ملی۔ مولاناؒ میں جو طبعی انکساری تھی اور شہرت ونام وری سے احتراز کی جو خو تھی، اس کی وجہ سے اُنھوں نے درجۂ علیا میں ترقی سے معذرت کی کہ بندہ اِس کا اہل نہیں ہے؛ لیکن مجلسِ شوری اُن کی اہلیت اور کارکردگیوں سے بہ خوبی واقف تھی؛ اِس لیے اُس نے اُنھیں بالاتفاق درجۂ علیا میں ترقی دی۔ اسی کے ساتھ اُنھیں نائب مجلس تعلیمی مقرر کیا گیا۔

۱۴۰۵ھ/۱۹۸۴ء میں ناظمِ مجلس تعلیمی مقرر ہوے، اس وقت اُنھوں نے محسوس کیا کہ نظامتِ مجلس تعلیمی کی ذمے داری کے ساتھ رسالہ ''دارالعلوم'' کی ذمے داری کو کما حقہ انجام دینا مشکل ہے، تو اُنھوں نے ثانی الذکر خدمت سے سبک دوشی حاصل کر لی۔

یہ زمانہ دارالعلوم میں ہنگامی حالات کا زمانہ تھا؛ لیکن مولاناؒ کی اپنی انتظامی صلاحیت اور قدرتی فہم وفراست کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اُن کا دورِ نظامت بہ خیر وخوبی گزرا؛ بل کہ اُنھوں نے صدر مدرس اور مجلس تعلیمی کے ارکان کے مشورے سے بہت سی مطلوبہ اصلاحات کیں جن سے دفتری امور میں آسانیاں پیدا ہوئیں، امتحانِ داخلہ کو تحریری طور پر منظّم کیا، امتحانِ شش ماہی کو سالانہ کی طرح با قاعدہ تحریری اور باوقار بنایا، تمام امتحانات میں امیدواروں کے نام کی بہ جائے کوڈ نمبر ڈالنے کا سلسلہ قائم کیا۔

۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۷ء میں اُنھیں ''شیخ الہند اکیڈمی'' کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا، اُن کے دور میں بہت سی علمی کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں اور اکیڈمی کے ماتحت منتخب طلبہ کو تصنیف و تالیف کے لیے تیار کرنے کے نظام کو باقاعدگی ملی۔

۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۱ء میں مجلسِ شوریٰ نے اُنھیں نائب مہتمم مقرر کرنے کی تجویز منظور کی، گو کہ وہ اس سے قبل اور اس کے بعد بھی بار بار عارضی طور پر قائم مقام مہتمم اور نائب مہتمم کی ذمّے داری انجام دیتے رہے؛ لیکن اب ان کی صحت اور ہمت پہلے جیسی نہیں رہ گئی تھی؛ اس لیے اِس منصب کی باقاعدہ ذمے داری کے تحمل سے اُنھوں نے معذرت کردی؛ حال آں کہ صدر جمعیۃ علماے ہند و رکن رکین مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سید اسعد مدنی نَوَّرَاللہُ مرقدہ (۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء = ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء) گھر آکر اس ذمے داری کو قبول کرلینے کے لیے اُن کو تیار کرنے کی کوشش کی؛ لیکن مولاناؒ شدت کے ساتھ اپنی معذرت پر قائم رہے۔ چند سال بعد مجلس تعلیمی اور اکیڈمی کی ذمے داریوں سے بھی سبک دوشی اختیار کرلی اور صرف ''اِیضاح البخاری'' کے کاموں کے لیے اپنے کو فارغ کرلیا۔

اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند میں اوّل عربی سے دورۂ حدیث شریف تک کی تمام کتابیں پڑھائیں؛ چناں چہ تقرر والے سالِ تعلیمی ۹۲-۱۳۹۱ھ/ ۷۲-۱۹۷۱ء میں علم الصرف، نحو میر، شرح مائۃ عامل، اِنشاے عربی، روضۃ الادب، نفحۃ العرب اور مشکاۃ الآثار پڑھائیں۔ سالِ تعلیمی ۹۳-۱۳۹۲ھ/ ۷۳-۱۹۷۲ء میں مختارات، شرح وقایہ، ہدایۃ النحو، کافیہ، صف ابتدائی (براے تدریس عربی زبان) اور صفِّ ثانوی، کے اسباق اُن سے متعلق رہے۔ سالِ تعلیمی ۹۴-۱۳۹۳ھ/ ۷۴-۱۹۷۳ء میں مختارات، مقاماتِ حریری، نورالانوار، ملاحسن، تمرین عربی اور الفیۃ الحدیث وغیرہ کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ سالِ تعلیمی ۹۵-۱۳۹۴ھ/ ۷۵-۱۹۷۴ء میں بھی مذکورالصدر کتابیں ہی زیرِ تدریس رہیں۔ سالِ تعلیمی ۹۶-۱۳۹۵ھ/ ۷۶-۱۹۷۵ء میں البلاغۃ الواضحہ، ہدایہ ثانی، الاشباہ والنظائر، حسامی، تمرین النحو اور کتاب النحو، آپ سے متعلق رہیں۔ سالِ تعلیمی ۹۷-۱۳۹۶ھ/ ۷۷-۱۹۷۶ء میں النحو الواضح، البلاغۃ الواضحہ اور ہدایہ ثانی نیز دیگر مذکورہ بالا کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ سالِ تعلیمی ۹۸-۱۳۹۷ھ/ ۷۸-۱۹۷۷ء میں ملاحسن، حسامی، اُصول الشاشی، نورالانوار، ہدایہ اوّل اور البلاغۃ الواضحہ کے اسباق آپ نے پڑھائے۔ سالِ تعلیمی ۹۹-۱۳۹۸ھ/ ۷۸-۱۹۷۷ء میں تفسیر ابن کثیر (سورۂ بقرہ و آل عمران) البلاغۃ الواضحۃ، ہدایہ ثانی اور دیوان متنبّی، آپ کے زیرِ تدریس رہیں۔ سالِ تعلیمی ۱۴۰۰-۱۳۹۹ھ/ ۷۹-۱۹۷۸ء میں تفسیر ابن کثیر، شرحِ

عقائد، ہدایہ ثانی اور البلاغۃ الواضحہ آپ سے متعلق رہیں۔ سال تعلیمی ۱۴۰۱-۱۴۰۰ھ/ ۸۰-۱۹۷۹ء میں مشکاۃ شریف، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ ، دیوانِ حماسہ اور سبعہ معلقہ کے اسباق آپ کے ذمّے رہے۔ سال تعلیمی ۱۴۰۲-۱۴۰۱ھ/ ۸۱-۱۹۸۰ء میں مشکاۃ، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ ، دیوانِ حماسہ، ابن ماجہ شریف اور ہدایہ ثانی، آپ سے متعلق رہیں۔

سال ہائے تعلیمی ۱۴۰۳-۱۴۰۲ھ/ ۸۲-۱۹۸۱ء اور ۱۴۰۴-۱۴۰۳ھ/ ۸۳-۱۹۸۲ء اور ۱۴۰۵-۱۴۰۴ھ/ ۸۴-۱۹۸۳ء میں مشکاۃ شریف مع نخبہ، البلاغۃ الواضحہ اور ابن ماجہ شریف پڑھائیں؛ البتہ آخرالذکر سال میں حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس بھی آپ سے متعلق رہی۔

سال ہائے تعلیمی ۱۴۰۶-۱۴۰۵ھ/ ۸۵-۱۹۸۴ء اور ۱۴۰۷-۱۴۰۶ھ/ ۸۶-۱۹۸۵ء میں مشکاۃ شریف مع نخبۃ الفکر اور ابن ماجہ شریف ہی کے اسباق آپ کے ذمے رہے۔

سال ہائے تعلیمی ۱۴۰۸-۱۴۰۷ھ/ ۸۷-۱۹۸۶ء تا ۱۴۳۰-۱۴۲۹ھ/ ۸۸-۱۹۸۷ تا ۲۰۰۸-۲۰۰۸ء میں مشکاۃ شریف مع نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ اور ابن ماجہ شریف کے اسباق آپ سے متعلق رہے؛ البتہ دو تعلیمی سالوں: ۱۴۱۳-۱۴۱۲ھ/ ۹۲-۱۹۹۱ء اور ۱۴۱۴-۱۴۱۳ھ/ ۹۳-۱۹۹۲ء میں دیوانِ حماسہ اور سبعہ معلقہ کے اسباق بھی آپ کے ذمّے رہے؛ جب کہ سال ہائے تعلیمی ۱۴۱۵-۱۴۱۴ھ/ ۹۴-۱۹۹۳ء و ۱۴۱۶-۱۴۱۵ھ/ ۹۵-۱۹۹۴ء میں دونوں دیوانوں کی جگہ **"مواقف المسترشدین"** آپ سے متعلق رہی۔

زندگی کے آخری آٹھ نو سالوں یعنی ۱۴۳۰ھ تا ۱۴۳۸ھ/ ۲۰۰۹-۲۰۱۷ء ترمذی شریف اوّل اور البلاغۃ الواضحہ کے اسباق ہی آپ نے اپنے ذمے رکھے؛ کیوں کہ آپ نے تحریری مشاغل کے لیے اپنے کو فارغ کرلیا تھا اور ضعف عمری بھی اسباق کے زیادہ بار سے سبک دوش ہوجانے کا متقاضی ہوئی۔

❀ ❀ ❀

اے تو مجموعۂ خوبی.....

از: مولانا مفتی محمد راشد صاحب اعظمی
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

وہ نابغۂ روزگار ہستیاں جن کی حسین یادیں صدیاں گذر جانے کے بعد بھی دلوں سے محو نہیں ہوتیں؛ بلکہ وہ دلوں میں زندہ جاوید رہتی ہیں اور یہ عالم رہتا ہے۔ ع

"رفتید ولے نہ از دلِ ما"

بلکہ ان کے ظاہری حجابِ ہستی کے ہٹ جانے کے بعد ان کے باطنی کمالات، خصوصیات اور امتیازات اور نکھر کر سامنے آتے ہیں۔

وہ اپنی زندگی میں حتی الوسع بے نام ونشان رہنا پسند کرتے ہیں، اپنے کو چھپائے اور مٹائے رہتے ہیں؛ لیکن ان کے کمالات کا خالق ان کے کمالات کو ظاہر کر دیتا ہے "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ"

لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ظاہر و باہر کمالات کا احاطہ ہر کس و ناکس کے بس کا بھی نہیں ہے۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گلچینِ بہار تو زداماں گلہ دارد

ہمارے محبوب ومحترم استاذ حضرت مولانا ریاست علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ذاتِ گرامی کی بالکل یہی شان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو گوناگوں خصوصیات وکمالات کا ایسا جامع بنایا تھا کہ ان بہاروں کا گل چیں اپنی تنگیِ دامن پر نادم ہوتا ہے۔

جس طرح قطرۂ نیساں آغوشِ صدف میں پرورش پاکر گوہرِ آب دار بن جاتا ہے۔ اسی طرح ممتاز اور صالح فطرت افراد جب کیمیا اثر نگاہوں کا فیض پاتے ہیں تو آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک

اٹھتے ہیں۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ انتہائی خُردسالی میں یتیم ہوگئے۔علی گڈھ میں والد مرحوم اللہ کو پیارے ہوگئے وہ اسی کم سنی میں اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ اپنے بہت ہی شفیق پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے یہاں منتقل ہوگئے۔

دیوبند کی روح پرور فضا ان کے لیے آغوشِ صدف ثابت ہوئی، کم سنی ہی سے علمائے دیوبند کی فیض آگیں صحبتوں کا اثر ان پر نمایاں ہوتا گیا۔آگے چل کر فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں مسلسل حاضری، خدمت اور ان کے علوم ومعارف کے بحرِ بیکراں سے بھرپور استفادہ نے مولانا کی شخصیت میں نمایاں شان پیدا کردی۔استاذ کی فیض گستری اور شاگرد کی طلبِ صادق نے دونوں کو ایک دوسرے پر فدا کردیا۔استاذ کا گھر ہی ان کی ساری تگ ودو کا مرکز بن گیا۔

نَسِیْتُ کُلَّ طَرِیْقٍ کُنتُ أعْرِفُهُ
إلّا طَرِیقاً یُؤَدِّیْنِی إلی ربعکم

شاگرد کی فداکاری کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا حضرت الاستاذ کی خدمت میں تھے۔اسی دوران زلزلہ کے جھٹکے محسوس ہوئے۔دیگر حاضرین اپنے بچاؤ کے لیے محفوظ جگہوں کی طرف دوڑ پڑے۔مولانا نے فی الفور استاذ محترم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔اپنی حفاظت کی کوئی پرواہ نہیں کی۔انھیں فداکاریوں کا صلہ تھا کہ وہ اپنے استاذ کے علوم ومعارف کے سب سے بڑے امین اور شارح بنے۔ایضاح البخاری کے صفحات اس کے شاہد عدل ہیں۔استاذ محترم کے درس بخاری کو اس جامعیت اور حسن وخوبی کے ساتھ مرتب کیا کہ وہ مولانا کا بھی بہت بڑا علمی کارنامہ ثابت ہوا۔حضرت مولانا کے بے نظیر درس کی محدثانہ شان اور فقہی نکتہ سنجیوں، علوم واسرار شریعت کے بحر بیکراں کو اس شان کے ساتھ سمیٹا ہے کہ خود مولانا ہی کا یہ شعر سامنے آجاتا ہے۔

روشن ہے جمالِ انور سے پیمانۂ فخر الدین یہاں

مولانا نے ابتدا ہی سے دیوبند اور علمائے دیوبند کو بہت قریب سے اور بڑی عقیدت سے دیکھا تھا؛ اس لیے دارالعلوم کی نسیم جانفزا ان کی رگ رگ میں سماگئی تھی۔وہ علمائے دیوبند کے مسلک ومزاج اور ان کی روایات کے حامل اور قدر آشنا تھے اور یہی مسلک ومزاج ان کی متاعِ گرانمایہ تھا

اوراس سے ذرا سا بھی انحراف انھیں گوارہ نہ تھا، وہ اپنے شاگردوں اور طلبائے دارالعلوم کو بھی انھیں راہوں پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ طلبائے مدارسِ عربیہ جو دورانِ تعلیم یونیورسٹیوں اور کالجوں کے امتحانات دیتے تھے یا انگریزی اور کمپیوٹر وغیرہ سیکھتے تھے مولانا کو ان کا یہ عمل بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ اس کو طالبانِ علوم نبوت کی شانِ بلند سے فروتر سمجھنے کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اصول کے بھی خلاف سمجھتے کہ علوم عربیہ کی تحصیل کے زمانے میں ان چیزوں میں انہماک علوم میں گہرائی و گیرائی پیدا ہونے سے مانع بن جاتی ہے۔ ہاں ان علوم سے پہلے یا بعد میں سیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ع

شرکت غیر نہیں چاہتی غیرت میری

دارالعلوم دیوبند کا ترانہ جس وارفتگی اور کیف وشوق کے عالم میں لکھا، ترانوں کی دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے، وہ ایک ادبی شہ پارہ بھی ہے۔ دارالعلوم کا حسین تعارف بھی اوراس کی ڈیڑھ سو سالہ خدمات کا بہترین اور جامع مرقع بھی ہے۔ اس ترانے کے سامنے کسی ترانے کا رنگ جماہی نہیں۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مولانا کی عظمتِ کردار کے مختلف جلوؤں پر نظر ڈالیں تو جلوؤں کی کشش سے حیرت ہوتی ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔

کائنات کی سب سے عظیم ہستی جناب سرورکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وشمائل کے سلسلہ میں حضور ﷺ کے خادم خاص حضرت انسؓ فرماتے ہیں: **إنَّ رَسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم كَانَ إذَا صَافَحَ الرَّجُلَ لَمْ يَنْزَعْ يَدَهُ مِنْ يَدِهٖ حَتّٰى يَكُوْنَ هُوْ الَّذِيْ يَنْزَعُ يَدَهُ وَلَا يُصْرِفُ وَجْهَهُ عَنْ وَجْهِهٖ حَتّٰى يَكُونَ هُوَ الَّذِيْ يُصْرِفُ وَجْهَهُ عَنْ وَجْهِهٖ وَلَمْ يُرَ مُقَدِّمًا رُكْبَتَيْهِ بَيْنَ يَدَىْ جَلِيْسٍ لهُ.** (رواہ الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ شریف ج۲، ص ۵۲۰)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سے مصافحہ فرماتے تو آپ اپنا ہاتھ نہیں کھینچتے تھے؛ جب تک کہ وہی آدمی اپنا ہاتھ نہ کھینچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا چہرہ نہیں پھیرتے تھے؛ جب تک کہ وہی آدمی اپنا چہرہ نہ پھیرے۔ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے سامنے اپنے گھٹنے نہیں پھیلاتے تھے۔ حضرت انسؓ نے ان چند جملوں میں دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملہ کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاجِ مبارک کی پوری کیفیت بیان کردی ہے۔

کسی عظیم ترین ہستی کی طرف سے ہر طرح کے انسانوں کی عظمتِ نفس کی رعایت ان کی دل داری اور قدر افزائی کی اس سے بہتر کوئی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔

حضرت مولانا ریاست علی رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج وطبیعت کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ادائے مبارک سے، ہم بہت قریب پاتے ہیں۔

وہ آنے جانے والوں کی کثرت، حاجت مندوں کی بار بار اور وقت بے وقت آمد سے کبھی چیں بہ چیں نہیں ہوتے تھے؛ ہر ایک ساتھ شفقت وعنایت، غایت اپنائیت کا معاملہ، پرسشِ احوال اور حاجت مندوں کی خندہ پیشانی کے ساتھ حاجت برآری ان کا مزاج تھا۔ ان کی مجلس میں ہر فرد برابر کا شریک تھا، کہہ ومہ کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ ہر شریکِ بزم اپنی بات کہنے کا پورا حق رکھتا تھا اور حضرت کی توجہات وعنایات کا مکمل حق دار ہوتا تھا۔ درمیان درمیان میں حضرت کی نکتہ سنجیاں مجلس کو زعفران زار بناتی رہتی تھیں۔

بہت سے وہ حضرات جن کا مولانا سے تعلق دارالعلوم دیوبند کی تدریس اور مختلف اہم ذمہ داریوں سے وابستگی سے پہلے تھا، مولانا نے آخر تک اپنے ان احباب سے تعلق اور ان سے بے تکلفی میں کوئی فرق واقع نہیں ہونے دیا، ان سے پہلے ہی جیسا اعزاز واکرام اور برتاؤ کا معاملہ رہا۔

دوپہر کا قیلولہ سنت ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھنے پڑھانے والوں کی ایک ضرورت بھی ہے، اس کی وجہ سے دوسرے وقت میں کام کرنے کی ہمت اور بشاشت پیدا ہوتی ہے۔ عام زندگی گذارنے والوں کے نزدیک قیلولہ کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔ بہت سے لوگ عین اس وقت حضرت مولانا کی خدمت میں آجاتے، جب مولانا صبح کے گھنٹوں کی سرگرم محنت کے بعد دوپہر میں تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتے تھے۔ وہ دروازہ کھٹکھٹاتے مولانا فوراً بیدار ہوکر ان کو اندر بلا لیتے۔ ان سے بات کرتے، کسی طرح کی کبیدگی اور بے کیفی کا قطعاً کوئی اظہار نہ فرماتے، گھر کے لوگ کہتے آپ اندر مکان میں آرام فرمالیا کریں؛ تاکہ کچھ سکون حاصل ہوجائے۔ حضرت منع فرماتے اور باہری کمرے میں رہنا پسند فرماتے۔ مقصد یہی تھا کہ آنے جانے والے یا اپنی حاجتیں لانے والے پریشان نہ ہوں، اپنی راحت کو دوسروں کی راحت پر قربان کردینا انھیں بزرگوں کا حصہ تھا۔

یہ بھی درخواست کی گئی کہ ملاقات کے لیے کوئی وقت متعین فرمادیں۔ برجستہ فرمایا: کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملنے کا کوئی وقت متعین فرمایا تھا؟

حضرتؒ کی ذہانت، فطانت، نکتہ رسی، حاضر جوابی نوادرِ روزگار میں سے تھی، بذلہ سنجی اور مزاح

لطیف سے بھی اللہ نے انھیں خوب نوازا تھا، اگر ان کو جمع کیا جائے تو ''کتاب الاذکیار'' جیسا بہترین مجموعہ مرتب ہوجائے۔

وہ لوگوں کے بہت ہمدرد، بے حد خیرخواہ تھے۔ ان کی زندگی دوسروں کی بھلائی کے لیے وقف تھی؛ مگر دوسروں کا احسان مند ہونا انھیں پسند نہیں تھا۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

وہ امتِ مسلمہ اور عالمِ اسلام کے سلسلہ میں دلِ درمند رکھتے تھے، قومی اور ملی مسائل کی انھیں بہت فکر رہتی تھی۔ اس سلسلہ میں جمعیۃ علمائے ہند اور اس کے اکابر سے وہ ہمیشہ وابستہ رہے اور اس وابستگی پر انھیں فخر تھا۔ وہ طویل عرصہ تک جمعیۃ علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کے اہم رکن اور نائب صدر رہے؛ جب تک ہمت وتوانائی رہی اس کے اجلاس اور میٹنگوں میں اہمیت کے ساتھ شرکت فرماتے۔ اپنے اعذار کی وجہ سے اگر کسی اجلاس میں نہ شریک ہوتے تو اس اجلاس کی تمام تفصیلات جاننے کا اہتمام فرماتے، جمعیۃ کے عاملہ کے اجلاسوں میں ان کی رائے اور مشوروں کی بڑی اہمیت تھی۔ ان کی رائے ہر ایک کے لیے قابل لحاظ تھی۔ جمعیۃ کے بڑے بڑے اجلاس میں ان کی تقاریر بڑی پُرمغز اور اکابر کی روایات اور روح کے مطابق اور ہم جیسے نو واردوں کے لیے گرہ کشا ہوتی تھیں۔

تواضع اور فروتنی ان کی خاصۂ طبیعت تھی؛ لیکن سرگرانوں کے سامنے وہ سبک سر بھی نہیں تھے۔ کلمۂ حق کے اظہار میں وہ بہت جری تھے، اس سلسلہ میں کسی بڑے سے بڑے کا رُعب وجلال انھیں مرعوب نہیں کرسکتا تھا۔

زہد واستغنار میں بھی وہ اپنے اکابر واسلاف کے ہم رنگ تھے، وہ بعض دفعہ مقروض بھی رہے؛ لیکن اہلِ ثروت ودولت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ دینی غیرت وحمیت میں بھی بے نظیر تھے۔ آخر میں اس مصرع پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ ع

اے تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم

❁ ❁ ❁

مدتوں رویا کریں گے....

از: مولانا مفتی عبداللہ معروفی
استاذ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند

موت ہر ایک کو آنی ہے اور آتی ہے، مگر اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی موت اکیلے کی نہیں؛ بلکہ ایک آباد اور ہری بھری دنیا کو ویران کر دیتی ہے، استاذِ محترم شفقتِ مجسم حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری رحمہ اللہ، استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند، ونائب صدر جمعیۃ علماء ہند کی وفات حسرت آیات بھی ایسی ہی ایک رحلت ہے جس کی کسک ہر خاص وعام کو مدتوں رہے گی، جن کو آج مدظلہ العالی اور دامت برکاتہم جیسے الفاظ کے بجائے رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

وہ ایک ایسے فراغ دل اور سایہ دار درخت تھے جس کی چھاؤں میں اپنا پرایا، چھوٹا بڑا، امیر غریب، استاذ شاگرد، خواندہ وناخواندہ ہر ایک ہی پناہ لینے کی کوشش کرتا اور آپ بڑی ہی وسعتِ ظرفی سے اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دے بھی دیتے تھے، ایک طویل صحبت میں رہ کر ناچیز راقم الحروف نے جو محسوس کیا وہ یہ کہ دیوبند میں جس کا کوئی عزیز یا سرپرست نہیں ہوتا، ہمارے حضرت اس کے عزیز وسرپرست ہوتے، طلبہ اور فضلائے دارالعلوم کے علاوہ عام باشندگانِ شہر وقرب وجوار کی ایک بڑی تعداد کو میں نے آپ کو ''ابو'' سے خطاب کرتے یا ذکر کرتے سنا، سچ ہے، آپ اپنی صلبی اولاد ہی کے نہیں؛ بلکہ ہمارے جیسے نہ جانے کتنے وابستگان ومتوسلین، غریب الدیار وبے سہاروں کے ''ابو'' تھے۔

قدرت نے آپ کو زبردست انتظامی صلاحیت کے سات صالحیت سے بھی نوازا تھا، منتظم میں صلاحیت کے ساتھ جب صالحیت بھی ہوتی ہے تو اس کا انتظام پختہ اور مثمرِ برکات ہوتا ہے اور انتظام سے جڑے ہوئے افراد میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر مطمئن ہوتا ہے، مولانا مرحوم کی یہ خوبی تھی کہ لوگ ان سے مطمئن رہتے تھے اور نظام بھی مستحکم طریقہ سے چلتا تھا، مولانا نے اپنے متعلقہ نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش فرمائی، مثلاً دارالعلوم میں امتحانات کا نظم بہت مستحکم نہیں تھا، معیارِ تعلیم بلند کرنے

کے لیے آپ نے اساتذۂ کرام کے مشورہ سے ایک ایسا ٹھوس اور مضبوط نظام بنایا جو ہر قسم کے شک اور کمزوری سے محفوظ ہے جس کی وجہ سے معیارِ تعلیم بند ہونے کے ساتھ ملک میں دارالعلوم کی نئی انتظامیہ پر اعتماد بھی بحال ہوا؛ چنانچہ آج بھی دارالعلوم میں امتحانات مولانا مرحوم ہی کے قائم کردہ خطوط کے مطابق ہو رہے ہیں۔

آپ کا درس طلبہ میں انتہائی مقبول تھا، راقم الحروف کو آپ سے مشکوٰۃ شریف اوّل، شرح نخبۃ الفکر اور ابن ماجہ شریف پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، آخر میں دورۂ حدیث شریف کی اہم ترین فنی کتاب جامع ترمذی جلد اوّل کی تدریس آپ سے متعلق تھی، علمی بحثیں بہت مرتب اور منقح ہوتی تھیں، مسلکِ حنفی کی تشفی بخش ترجیحات کے ساتھ ساتھ، عقائد و فروعات میں اہل السنۃ والجماعۃ اور فکرِ دیوبند کی بھرپور ترجمانی اور طلبہ کی اس کے مطابق مثبت ذہن سازی آپ کے درس کا امتیاز تھا، اس پر زبان کی شستگی، محاورات کا برمحل استعمال اور نپے تلے الفاظ کی روانی سونے پر سہاگہ کا کام دیتی تھی۔

ناچیز راقم الحروف کو دورِ طالب علمی ہی سے حضرت مرحوم کی شفقتیں حاصل رہی ہیں، شوال ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء میں بندے کا داخلہ مادرعلمی دارالعلوم دیوبند میں ہوا، پنجم عربی کا سال تھا، ''نورالانوار'' کا سبق حضرت مولانا لقمان الحق صاحب رحمہ اللہ سے متعلق ہوا، جو حضرت مولانا سلطان الحق صاحب (ناظم کتب خانہ) رحمہ اللہ کے بڑے صاحبزادے تھے اور حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمہ اللہ کے برادرِ نسبتی بھی تھے، مولانا لقمان الحق صاحب رحمہ اللہ بھی طلبہ پر انتہائی شفیق تھے، ہم لوگوں کا ان کے گھر پر کثرت سے جانا ہوتا تھا، گاہے گاہے مولانا مرحوم کھانے پر بھی بلا لیتے تھے، حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمہ اللہ سے سب سے پہلے وہیں ملاقات ہوئی۔ وضع داری، غریب پروری اور ملنے جلنے والوں کا پاس ولحاظ مولانا سلطان الحق صاحب رحمہ اللہ کی پہچان تھی اور یہ وصف ان کے دونو نسبی و نسبتی صاحبزادگان میں بدرجہ اتم منتقل ہوا، حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمہ اللہ اِس غریب طالب علم پر صرف اس لیے شفقت کا برتاؤ کرتے تھے کہ ''بھائی لقمان'' سے اس کا خصوصی تعلق ہے؛ چنانچہ بارہا اپنے اعزا، اور متعارف لوگوں سے حضرت مرحوم نے احقر کا اسی عنوان سے تعارف بھی کرایا تھا، پھر جب حضرت مرحوم سے براہِ راست استفادہ ہونے لگا تو یہ تعلق بالواسطہ ہونے کے بجائے بلاواسطہ اور مضبوط ہوگیا۔

حضرت مرحوم کو بدلتے حالات میں ملتِ اسلامیہ کے تقاضوں کے مطابق دارالعلوم کی جانب سے عملی اقدامات کی بھی دھن رہتی تھی، چنانچہ آپ نے اپنے دورِ نظامت میں شعبۂ تخصص فی الحدیث

کے قیام کی تجویز رکھی اور آپ کی تحریر پر ۱۴۱۱ھ میں مجلس شوریٰ نے اسے منظور بھی کرلیا؛ لیکن کسی وجہ سے اس تجویز کو عملی شکل دینے میں تاخیر ہوتی گئی اور ۱۴۲۰ھ میں حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب دامت برکاتہم کو نگراں مقرر کرکے باضابطہ شعبے کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدائی خاکہ اور نصاب وطریقۂ کار کے تعین کے سلسلہ میں حضرت مرحوم، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مدظلہ کے معاون ومشیر رہے اور الحمدللہ ایک جامع ومفید دوسالہ نصاب مرتب ہوکر کام شروع ہوگیا۔

اس شعبہ میں مستقل مدرس کی حیثیت سے احقر کا تقرر عمل میں آیا، جس میں حضرت مرحوم کا انتہائی اہم کردار رہا، شعبۂ تخصص فی الحدیث کے نصاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں محدثین اور فقہاء دونوں کے مذاق کا یکساں طور پر خیال رکھا گیا ہے، نہ تو فقہی پہلو کو نظر انداز کرکے صرف قواعدِ محدثین ہی کی تطبیق ومشق میں طلبہ کو لگادیا جاتا ہے کہ فقہائے کرام کی تمام تر کاوشیں ہمارے فاضل کو کمزور اور بے دلیل نظر آنے لگیں اور نہ ہی طریقۂ محدثین کے مطابق حدیثوں کی تصحیح وتضعیف کے اصول کی معرفت اور تطبیق کی مشق میں کوئی کسر چھوڑی جاتی ہے؛ بلکہ ناقدینِ حدیث کے معیارِ تنقید کو باریکی سے پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے؛ تاکہ اس فن میں ہمارے باحث کو مکمل بصیرت حاصل ہو اور فکری آزادی وکج روی سے محفوظ رہتے ہوئے حدیثوں پر حکم لگانے کی ان میں صلاحیت پیدا ہو، ساتھ ہی فقہی ابواب کی اُن احادیث کی ایک معتد بہ مقدار بھی طلبہ کو یاد کرادی جاتی ہے جن سے حضراتِ فقہاء استدلال کرتے ہیں؛ چنانچہ تین سو (۳۰۰) احادیث کو ان کی اسنادی حیثیت سمیت حفظ کرنے کا ہر طالب علم پابند ہوتا ہے۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمہ اللہ کو اس شعبہ سے اتنی دلچسپی تھی کہ ہر سال حفظِ حدیث کا امتحان شوق سے لیتے تھے؛ چنانچہ وفات سے چند روز قبل بھی دونوں جماعتوں کے امتحانات لیے اور شعبہ کی عمدہ کارکردگی کو سراہا۔

حضرت مرحوم اس شعبہ کی افادیت، اس کے نصاب اور طریقۂ کار کے اس قدر قائل تھے کہ آپ نے ملک میں اس طرز پر دیگر اداروں کے قیام یا مدارس وجامعات میں اسی نہج پر تخصصاتی شعبے قائم کرنے کا مخلصانہ مشورہ بھی دیا ہے، ۱۴۲۵ھ میں طلبۂ تخصص کے ذریعہ انجام پانے والے اہم علمی وتحقیقی کام کا "**الحدیث الحسن فی جامع الترمذی/ دراسة وتطبیق**" پر اپنی تقریظ میں رقم طراز ہیں:

"وحقًا لو أشار أحد علیٰ معاهد التخصص فی علوم الحدیث باتباع هذا المنهج القویم فی دراساتها، أو أوصی إلی الجامعات ودور التعلیم بإنشاء الأقسام

التابعة لها علىٰ هذا المنوال؛ لكان إشارته غنما وجديرًا بالقبول والتقدير“.

یعنی علومِ شرعیہ کے دیگر تخصصاتی اداروں، یا یونیورسٹیوں کے تخصصاتی شعبوں کو اسی نصاب اور طریقۂ کار کی اقتدار کرنی چاہیے، اگر یہ مشورہ دیا جائے تو قابلِ قبول اور قابلِ توجہ مشورہ ہوگا۔

کچھ قابلِ تقلید صفات

یوں تو حضرتِ مرحوم گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے، ان میں چند قابلِ تقلید خوبیاں حسبِ ذیل ہیں:

۱- تواضع وکسرنفسی

یہ صفت حضرتِ مرحوم میں فطری تھی، لباس اور وضع ایسی اختیار کرتے جس میں کسی قسم کا امتیاز نہ ہو، مجلس میں اپنی نشست اس طرح رکھتے کہ حاضرین کی نشست سے ممتاز نہ ہو، کوئی نو وارد شخص ملنے آتا تو مجلس میں حضرت مرحوم کے تعین وتشخص میں اسے تذبذب ہوتا؛ بلکہ حضرت کے علاوہ مجلس میں شریک کسی صاحب کو حضرت سمجھ کر اپنا مدعا عرض کرنے لگتا۔ کوئی علمی انداز کا سوال کرتا تو فرماتے: بیٹے یہ سوال تو مفتی سعید احمد صاحب یا مولانا نعمت اللہ صاحب سے کرنے کا ہے۔ کوئی اپنے یا اپنے عزیز کے متعلق آسیبی اثرات وغیرہ کی بات کہہ کر تعویذ وغیرہ کا طالب ہوتا تو فرماتے: بھائی تم غلط جگہ آگئے، یہ کام صوفی اسماعیل کا ہے، آپ کے سبق سے متاثر ہونے والے غیر متعارف طلبہ اگر برائے ملاقات آجاتے تو فرماتے: بیٹے مجھ سے مل کر تمہیں کیا ملے گا؟ چائے پی لو۔

کرتا عموماً گھٹنے تک، پائجامہ علی گڈھی اور دو پلی ٹوپی پہنتے، نو وارد مہمانوں کو حضرت کا یہ لباس آپ کے علمی وعرفی مقام ومرتبہ سے میل کھاتا ہوا نظر نہ آتا تو انھیں شک اور تردد ہوتا، ایک بنگالی فاضل نے جو آپ کے شاگرد تھے ایک مرتبہ ہمت کر کے عرض کیا: حضرت ہمارے دیار میں بڑے علماء ٹخنوں تک لمبے جبے پہنتے ہیں، تو برجستہ فرمایا: بیٹا! کیا کروں اپنے اندر اتنے ہی کی اوقات پاتا ہوں۔

۲- دیانت واحساسِ ذمہ داری

یہ وصف آپ کی زندگی کا نمایاں ترین وصف ہے، دیانت وامانت کے آپ پیکر تھے، نیز دارالعلوم کی جانب سے سپرد کی جانے والی ذمہ داریوں کو دیانت کے ساتھ کما حقہ نبھانا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے، وقت پر حاضری، سبق کی پابندی، امتحانات میں دلچسپی کے ساتھ شرکت ہر شخص پر ظاہر وعیاں ہے، دارالعلوم میں امتحانات کی ذمہ داری چند سالوں سے احقر سے متعلق رہا کرتی ہے اور اس سلسلہ میں حضرت مرحوم میرے لیے بہت بڑے سہارا تھے، اہم امور میں حضرت سے مشورہ ہوتا اور

حضرت مناسب مشوروں سے نوازتے، آخری امتحان سالانہ میں جب کہ ضعف بڑھ گیا تھا ہر روز رکشہ سے دارالامتحان تشریف لاتے، دارالامتحان میں داخل ہونے کے لیے بہت سے زینوں پر چڑھنا اترنا پڑتا تھا، جس کی تاب لانا مشکل ہوتا، امتحان گاہ میں داخل ہوکر کسی قریبی کرسی پر تھوڑی دیر دم لیتے پھر مقررہ نشست گاہِ اکابر تک بہ تکلف تشریف لے جاتے، بحیثیت ذمہ دارِامتحان احقر نے عرض کیا کہ حضرت آپ تشریف نہ لائیں، گھر ہی سے توجہ اور دعا فرماتے رہیں، فرمایا کہ جب گھنٹہ کی آواز سنتا ہوں تو رہا نہیں جاتا، ایک روز حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے بھی یہی بات فرمائی، پھر بھی تشریف لاتے رہے، ایک روز حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مدظلہ سے پوچھا کہ کیا مہتمم صاحب یا کسی ذمہ دار کی اجازت دینے سے میرے لیے حاضری سے رکنا جائز ہے؟ مولانا نے فرمایا: ''اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ'' اپنے دل سے پوچھیے (مشکوٰۃ)، ظاہر ہے مہتمم صاحب کے فرمانے پر تو آپ کو رک ہی جانا چاہیے تھا؛ مگر واہ رے دیانت واحساسِ ذمہ داری! کہ ان کے دل نے حاضر ہونے ہی کا فتویٰ دیا اور آخری دن تک تشریف لاتے رہے۔

۳- خوردنوازی وحوصلہ افزائی

خورد نوازی اور چھوٹوں کی حوصلہ افزائی تو آپ کا طرۂ امتیاز تھا، اپنے تعلق رکھنے والے شاگردوں، خصوصاً نوجوان اساتذۂ دارالعلوم کو اہم موضوعات پر تصنیف اور مطالعہ کا شوق دلاتے رہتے تھے، براہِ راست کہنے کے بجائے موضوع سے متعلق کچھ سوالات اور قابلِ غور پہلو سامنے لاتے؛ تاکہ انھیں خود پڑھنے اور لکھنے کا شوق ہو؛ چنانچہ اس طرح متعدد اساتذہ اور فضلاء کے ذریعہ کئی اچھے اور مفید کام سامنے آگئے۔

۴-خودداری وبے نیازی

یہ صفت بھی آپ کی طبعی تھی، غیرت وخودداری آپ کا ایسا قیمتی اثاثہ تھا جس کو ٹھیس لگنا کسی قیمت پر آپ کو گوارا نہیں تھا، اپنی ضرورت کسی سے نہ کہتے، اپنا کام خود کرتے، ضرورت کے باوجود طلبہ تو کیا صاجزادگان تک سے بھی بدنی خدمت کبھی نہیں لیتے، کوئی ہدیہ پیش کرتا، اگر شناسا نہ ہوتا تو قبول ہی نہ فرماتے، بہت اصرار کرتا تو گرانی کے ساتھ قبول فرمالیتے اور ذاتی استعمال میں لانے سے پھر بھی احتیاط برتتے؛ البتہ شناسا اور بے تکلف لوگوں سے تکلف کے ساتھ قبول فرمالیتے تھے، راقم الحروف نے بارہا آپ کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا جوان کے واقعی حال کا ترجمان ہے۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری — کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

راقم الحروف نے یہ دعا بھی بارہا آپ کی زبان سے سنی کہ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ بنائے، آپ کے محبوبِ حقیقی نے اس خواہش کا خیال رکھتے ہوئے اسی شانِ بے نیازی کے ساتھ اس دارِ فانی سے کوچ کرنے کا انتظام فرمایا، ایسا لگا جیسے عصا لے کر معمول کے مطابق دارالعلوم کی طرف جارہے ہوں کہ اچانک مزارِ قاسمی کی گلی پر پہونچ کر بائیں طرف مڑ گئے اور جوارِ قاسمی میں جاکر لیٹ گئے۔

وفات ۲۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء روز شنبہ بوقت ۴؍بجے صبح ہوئی، حضرتِ مرحوم کے ایک باصلاحیت و باذوق شاگرد جناب مولانا مفتی محمد طاہر صاحب اعظمی مقیم حال جدہ سعودی عرب نے درج ذیل مادۂ تاریخ وفات نکالے ہیں: ''محمودِ جہاں مولانا ریاست علی صاحب بجنوری'' (۱۴۳۸ھ)۔

''محمودِ جہاں مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمہ المقسط المجیب'' (۲۰۱۷ء)۔

''محدثِ نکتہ شناس'' (۱۴۳۸ھ)

بگو استاذِ خود را سالِ رحلت غمزدہ طاہر ''کہ باید لحد فردوسِ بریں از رحمتِ مولیٰ'' ۱۴۳۸ھ

جھکا کر سر سنِ رحلت میں جب ہم غور کرتے ہیں
ندا پہونچتی کی جنت میں وہ مُفرح سیر کرتے ہیں (۲۰۱۷ء)

اللّٰهم اغفر له وارحمه وعافه ونقه من الخطايا كما نقيت الثوب الأبيض من الدنس، اللّٰهم لا تحرمنا أجره ولا تفتنا بعده. آمين!

❁ ❁ ❁

علم وادب کی ریاست کے بادشاہ
حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ

از: حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

کچھ ادارے تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں اور جو کچھ خدمات ان کے لیے مقدر ہیں، انھیں انجام دے کر تاریخ کے خاکستر میں دب جاتے ہیں، اور کچھ اللہ کی طرف سے تاریخ ساز بن جاتے ہیں، جو صرف پھل نہیں دیتے؛ بلکہ ان درختوں کو جنم دیتے ہیں، جن سے پھل پیدا ہوں، جو صرف پھول نہیں دیتے؛ بلکہ ایک پھلواری کو وجود میں لاتے ہیں، جو صرف روشنی نہیں دیتے؛ بلکہ ایسے چراغ وجود میں لاتے ہیں، جن کی لو سے ہزاروں چراغ جلائے جاتے ہیں، ایسے ہی بافیض اداروں میں ایک دارالعلوم دیوبند ہے، یقیناً دارالعلوم ایک سمندر ہے، جس سے علم کی نہریں پھوٹتی ہیں، وہ ایک آفتابِ جہاں تاب ہے، جس سے ہزاروں ستاروں کو روشنی ملتی ہے اور وہ ایک شجرِ طوبیٰ ہے؛ جس کی سایہ دار ٹہنیاں مشرق سے مغرب تک سایہ فگن ہیں: ''اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا، كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ، اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ. (ابراہیم:۲۴)

دارلعلوم نے اپنے قیام سے لے کر آج تک ہر عہد میں بڑے بڑے اہلِ علم کو جنم دیا ہے، بیسویں صدی میں جو علماء، اصحابِ فکر اور اہلِ نظر اس دانش گاہ سے پیدا ہوئے، ان میں ایک قابل ذکر شخصیت استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کی تھی، اس حقیر کو ۱۳۹۶ھ میں اس عظیم درسگاہ میں حاضری کا اور یہاں سے کسبِ فیض کا موقع ملا، اس وقت مولانا موصوف وسطیٰ کے استاذ تھے اور غالباً ششم عربی تک کی کتابیں آپ سے متعلق تھیں، میرے عم محترم حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ اور ان کے درمیان بڑے اچھے مراسم تھے، قاضی صاحب ابتدائے سال ہی میں کسی مناسبت سے تشریف لائے اور مولانا موصوف نے اپنے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب

(ناظم کتب خانہ) کے یہاں ان کی پرتکلف ضیافت کا اہتمام کیا، مجھے بھی قاضی صاحبؒ کے ساتھ اس میں شرکت کا موقع مل گیا تھا، اس وقت پہلی بار قریب سے مولانا کو دیکھنے کا موقع ملا، مولانا کے سراپا اور مزاج واخلاق کی تصویر اسی وقت سے ذہن میں نقش ہے، کِھلا ہوا رنگ، درمیانہ قد وقامت، سیاہ داڑھی، جس کے چند بال سفید تھے، کشادہ پیشانی، دو پلی ٹوپی، کرتا اور شلوار، سر سے پاؤں تک سفید پوش، سنجیدہ ومتین لیکن خوش مزاج، زبان ایسی کہ جیسے الفاظ سنگ مرمر سے تراشے گئے ہوں، بےتکلف اور مہربان، احباب اور شاگردوں کے ساتھ گفتگو میں ظرافت کی آمیزش اور محبت آمیز طنز، حاضر جواب، بروقت اساتذۂ شعروسخن کے کلام کا استعمال کچھ اس برجستگی سے کرتے کہ گویا یہ شعر اسی موقع کے لیے کہا گیا ہو، مہمان نواز، طلبہ کے ہمدرد، بزرگوں کے نیازمند اور معاصرین کے قدرداں۔

ان کا نسب میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے، اور سلسلۂ نسب میں شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی (متوفی ۳۶۶ھ) اور ہندوستان کے معروف صاحبِ علم، استاذ الاساتذہ قطب الدین سہالویؒ (متوفی: ۱۱۳۰ھ) کے اسماء گرامی بھی ملتے ہیں؛ جس سے اس خاندان کے علمی مقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اسی خاندان کی ایک نیک سیرت شخصیت منشی فراست علی مرحوم اپنے آبائی مقام موضع حبیب والا، ضلع بجنور سے علی گڑھ منتقل ہوگئے تھے، جو مولانا کے والد ماجد تھے اور پیشہ تدریس سے تعلق رکھتے تھے، یہیں ۹/مارچ ۱۹۴۰ء کو محلّہ حکیم سرائے میں آپ پیدا ہوئے، ۱۹۵۱ء میں مقامی پرائمری اسکول سے چوتھی جماعت کی تکمیل کی، پھر ان کے پھوپا اور کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے ناظم مولانا محمد سلطان الحق صاحبؒ کی جوہر شناس شخصیت نے اپنے ساتھ لیا اور آپ دیوبند لائے گئے، ابتداء سے انتہاء تک دارالعلوم ہی سے کسبِ فیض کیا، یہاں تک کہ ۱۹۵۸ء میں فراغت حاصل کی اور اول درجہ سے کامیاب ہوئے۔

اس وقت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے تلمیذ رشید حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے، ان کا درس علم وتحقیق، موضوع کے احاطہ اور زبان وبیان کی خوبصورتی کے لحاظ سے ایک بے مثال درس تھا، شاید یہ کہنا بےجا نہ ہوگا کہ ان کے بعد دارالعلوم کی مشیختِ حدیث کو اس درجہ کا کوئی اور شخص نہیں ملا، "وَلَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْراً"، حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کچھ اس طرح ان کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوئے کہ جب تک وہ زندہ رہے، ہمیشہ فیضیاب ہوتے رہے، ۱۳۹۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں درجۂ ابتدائی میں مدرس مقرر

ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے ۱۴۰۳ھ میں درجۂ علیا کے استاذ ہوگئے، پھر تادمِ وفات تدریس سے اپنا تعلق برقرار رکھا، اخیر زمانہ میں سنن ترمذی جیسی حدیث کی اہم کتاب جس کو دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم مزاج اداروں میں خصوصی اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے اور لائق ترین استاذ سے اس کی تدریس متعلق کی جاتی ہے، آپ سے متعلق رہی۔

جس وقت یہ حقیر دارالعلوم دیوبند پہنچا تھا، اس وقت دورہ حدیث کی کتابیں بہت ہی سینئر اساتذہ سے متعلق تھیں، جن میں سوائے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم کے اب کوئی شخصیت باقی نہیں رہی، اللہ تعالیٰ ان تمام بزرگوں کو شایانِ شان اجر عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے؛ لیکن اس وقت درجۂ وسطیٰ کے دوتین اساتذہ کا درس بہت مقبول تھا، طلبہ ان سے بہت خوش رہتے تھے اور ان کے ثنا خواں تھے، ان میں ایک نام حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری صاحبؒ کا بھی تھا۔

ان میں چوں کہ شفقت کا رنگ غالب تھا، مزاج میں بے تکلفی اور شائستہ ظرافت تھی، ہٹو بچو کا مزاج نہیں تھا؛ اس لیے طلبہ ان سے قریب رہتے تھے، وہ طلبہ بھی جو اُن سے پڑھے ہوئے تھے، وہ بھی جن کے اسباق اُن سے متعلق نہیں تھے اور وہ بھی جو اُن سے پڑھ کر فارغ ہوچکے تھے؛ اس لیے مولانا کے پاس طلبہ کی کافی آمد ورفت رہتی تھی، ان کا ادبی ذوق بھی بہت اونچا تھا؛ اس لیے طلبہ ان سے اپنی تحریروں کی اصلاح کے لیے بھی رُجوع ہوا کرتے تھے اور وہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے۔

ان کی صلاحیت ہمہ جہت تھی، شاعر تو وہ تھے ہی، نثر کا ذوق بھی بڑا اونچا تھا، اسی نسبت سے ۱۴۰۲ھ میں ''ماہ نامہ دارالعلوم'' کے مدیر مسئول مقرر ہوئے، نیز ان کے علمی وتحقیقی مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۴۰۸ھ میں انھیں ''شیخ الہند اکیڈمی'' کا نگران مقرر کیا گیا، عام طور پر جو لوگ علمی میدان کے شہسوار ہوتے ہیں، ان میں انتظام وانصرام کا سلیقہ نہیں ہوتا؛ لیکن مولانا کو اللہ نے اس صلاحیت سے بھی نوازا تھا، وہ اُصولوں پر قائم رہتے ہوئے لوگوں کو خوش رکھنے کا فن جانتے تھے، اسی نسبت سے انھیں پہلے ''مجلسِ تعلیمی'' کا نائب ناظم پھر ناظم مقرر کیا گیا، کئی بار عارضی طور پر ''نائب مہتمم'' اور ''کارگذار مہتمم'' کی ذمہ داری بھی متعلق کی گئی، پھر مستقل طور پر نائب مہتمم مقرر کرنے کا بھی فیصلہ ہوا؛ لیکن آپ نے معذرت کردی؛ بلکہ عمر کے اخیر حصہ میں تمام انتظامی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوکر

تدریس اور ایضاح البخاری کی ترتیب کے لیے یکسو ہوگئے۔

ان کا خط بھی بڑا پاکیزہ ہوا کرتا تھا، ایسا لگتا تھا کہ الفاظ کے موتی کاغذ پر بکھیر دیئے ہیں، میرے ایک استاذ حضرت مولانا فضل الرحمٰن قاسمی صاحبؒ ان کے ہم درس تھے اور دونوں میں دوستانہ تعلق تھا، وہ ان کا بڑا ذکرِ خیر کیا کرتے تھے اور اپنے دو ساتھیوں کے حسنِ تحریر کا ذکر کرتے تھے، ایک: مولانا موصوف کا، دوسرے: حضرت مولانا محمد حنیف ملیؒ (مالیگاوں) کا، اور کہتے تھے کہ مولانا حنیف ملی خوش رقم تھے اور مولانا ریاست علی صاحب خوش رقم بھی تھے اور زود رقم بھی، شاید اسی لیے وہ مولانا فخر الدین صاحب کے درس کے بہتے دریا کو لوح وقرطاس پر لانے میں کامیاب ہوئے۔

تدریسی، تربیتی اور انتظامی مصروفیات کی وجہ سے مولانا کو تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ توجہ دینے کا موقع نہیں ملا؛ حالاں کہ اگر وہ اس جانب توجہ دیتے تو ان کا شمار ان کے دور کے بڑے مصنّفین میں ہوتا؛ لیکن ان کی دو تحریری یادگاریں ہمارے سامنے ہیں، ایک: ''شوریٰ کی شرعی حیثیت''، جس میں انھوں نے شورائی نظام کی اہمیت اور اس کے اختیارات پر بڑی فاضلانہ گفتگو کی ہے؛ اگرچہ ایک خاص پس منظر میں استاذ گرامی حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ کے ایما پر انھوں نے یہ کتاب تالیف کی ہے؛ لیکن نفسِ موضوع کے اعتبار سے بھی یہ بڑی اہم کتاب ہے اور اُردو زبان میں شاید اس مسئلہ پر اتنی تفصیل کے ساتھ قلم نہیں اُٹھایا گیا ہے۔

دوسرا کام؛ بلکہ کارنامہ ''ایضاح البخاری'' کی ترتیب ہے، یہ کام میری نظر میں اس لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کتاب نے مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ کو علمی ودرسی دنیا میں زندہ رکھا ہے، امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ لیث ابن سعد امام مالکؒ سے زیادہ فقیہ تھے؛ لیکن ان کے شاگردوں نے ان کو ضائع کردیا؛ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ علمی شخصیتیں اکثر اپنے تصنیفی وتالیفی کارناموں سے زندہ رہتی ہیں، اور اگر کسی شخص کو تصنیف وتالیف سے اشتغال کا موقع نہیں ملا، یا ان کا علمی سرمایہ محفوظ نہیں رہا تو اگر شاگردوں نے ان کے افادات کو جمع کیا تو یہ ان کی زندگی کو باقی رکھتا ہے، ورنہ آہستہ آہستہ ان شخصیت لوگوں کے ذہن سے محو ہوجاتی ہے، اس کی سب سے بڑی مثال خود امام ابوحنیفہؒ ہیں کہ آپ کی براہ راست تصنیفات محفوظ نہیں رہ سکیں اور جو چیزیں باقی ہیں اور آپ کی طرف منسوب ہیں، اہل علم کے نزدیک ان کی نسبت مشکوک ہے؛ لیکن آپ کے باکمال شاگردوں، خاص کر امام محمدؒ کے ذریعہ آپ کا علمی وفقہی سرمایہ محفوظ ہوگیا، جو آج اہلِ علم کی آنکھوں کا سرمہ بنا ہوا ہے اور اہل السنۃ

والجماعت کی غالب تعداد آپ ہی کے فقہی اجتہادات کی متبع ہے۔

یہ صورت حال ہر دور میں پیش آئی ہے، بزرگانِ دیوبند میں استاذ الاساتذہ علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ ایک امتیازی شان کے استاذ تھے، میں نے حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ سے ان کے بارے میں سنا کہ وہ ایسے عالم تھے کہ بڑے سے بڑا عالم بھی اگران کے سامنے بیٹھتا تو اس پر اس کا جہل واضح ہوجاتا؛ لیکن علامہ بلیاویؒ کا کوئی قابلِ ذکر تالیفی سرمایہ محفوظ نہیں رہ سکا اور نہ شاگردوں نے ان کے افادات مرتب کیے؛ اس لیے موجودہ دور کے نوجوان علماء کے یہاں شاذ و نادر ہی ان کا ذکر ملتا ہے، اگر مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری صاحبؒ نے اپنے محبوب استاذ مولانا فخرالدین احمد صاحبؒ کے درس بخاری کو مرتب نہیں کیا ہوتا تو ان کے تمام تر علمی و درسی کمالات کے باوجود آج ان کا حال علامہ بلیاویؒ سے مختلف نہیں ہوتا اور صرف تاریخ دارالعلوم میں ان کا نام پڑھنے کو ملتا؛ اس لیے مولانا ریاست علی صاحبؒ نے اپنے استاذ کے افادات کو مرتب کرکے ان کی شخصیت کو زندہ جاوید بنادیا۔

میرا خیال ہے کہ گہرے مضامین کو خوبصورت تعبیر میں بیان کرنے اور دقیق فنی مسائل کو زبان و بیان کے محاسن کے ساتھ پیش کرنے کے اعتبار سے درسی شروح کی دنیا میں ''ایضاح البخاری'' ایک منفرد کتاب ہے، جس کا اپنا رنگ وآہنگ ہے؛ حالاں کہ گاہے گاہے طولِ کلام بھی ہے؛ لیکن پڑھنے والوں کی طبیعت اُکتاتی نہیں ہے اور مضمون دوپہر کی دھوپ کی طرح واضح ہوجاتا ہے، میں پہلے اس کتاب کی حسنِ تعبیر کو دیکھ کر سمجھتا تھا کہ شاید مولانا فخرالدین صاحبؒ کے مفہوم کو مولانا ریاست علی صاحبؒ نے اپنے الفاظ کا پیرہن دیا ہے؛ کیوں کہ سنجیدہ اور دقیق مضامین کو اتنی خوبصورت تعبیر میں برجستہ پیش کرنا بظاہر ممکن نہیں ہوتا؛ لیکن میں نے خود مولانا ریاست علی صاحب سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت کی تقریر ہوتی ہی ایسی تھی اور اس میں الفاظ بھی ان ہی کے ہیں، پھر حضرت مولانا فخرالدین صاحبؒ کے بعض اور شاگردوں نے بھی بتایا کہ مولانا کے درس کی زبان بڑی خوبصورت اور مرتب ہوا کرتی تھی؛ لیکن بہرحال اتنے تفصیلی درس کو اخذ کرنا اور ان کی نقل و ترتیب کا کام انجام دینا بھی کوئی معمولی کام نہیں ہے، اس کے علاوہ حسبِ ضرورت مراجع سے رُجوع کرنے، عنوانات قائم کرنے، کہیں کوئی خلاء رہ گیا ہو تو اسے پُر کرنے کا کام فاضل مرتب ہی کے ذریعہ ہوا ہے، پھر تقریر وتحریر کی زبان میں فرق ہوتا ہے، تقریر کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو، جب اس کو تحریر کا پیکر دیا جاتا ہے تو بہت کچھ حک واضافہ کرنا پڑتا ہے اور یہ سب کام آپ ہی نے انجام دیا ہے۔

میں نے خاصا عرصہ پہلے ذکر کیا تھا کہ اگر یہ کام آپ کے ہاتھوں مکمل ہوجاتا تو بڑا اچھا ہوتا اور یہ کتاب استاذ وشاگرد دونوں کی یادگار بن جاتی، مولانا نے بتلایا کہ اب میں واقعی یکسو ہوکر اس کام کو مکمل کرنا چاہتا ہوں؛ لیکن حضرت کی زیادہ تر بحث جلد اول میں کتاب الایمان، کتاب العلم اور ابتدائی ابواب اور جلد دوم میں مغازی وتفسیر میں ہوا کرتی تھی، چاہتا ہوں کہ پہلے اس کو مکمل کرلوں، ''ایضاح البخاری'' کی اب تک دس جلدیں منظرِعام پر آگئی ہیں، اللہ کرے کہ یہ کام مکمل ہوجائے۔

انھوں نے دارالعلوم میں طالب علمی کے آغاز سے اپنی وفات تک ایک دو سال چھوڑ کر دارالعلوم ہی کے احاطہ میں پوری زندگی گذاری، وہ دینی جلسوں اور علمی مجلسوں میں کبھی کبھی چلے جایا کرتے تھے؛ لیکن اس کا معمول بہت کم تھا، وہ ایک باکمال اور فرض شناس مدرس کی شان کے مطابق اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دارالعلوم میں گذارتے تھے، وہ نہ صرف مسلکِ دیوبند پر ثابت قدم تھے؛ بلکہ تعلیمی اور تربیتی منہج میں بھی دیوبند کے موجودہ تعلیمی منہج اور نصابِ تعلیم کو ہی مدارسِ اسلامیہ کے لیے سب سے بہتر تصور کرتے تھے، چند سال پہلے دارالعلوم وقف دیوبند میں دینی مدارس کے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم پر ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' نے ایک دوروزہ سیمینار رکھا تھا، اس میں دیوبند ہی کے رہنے والے ایک نوجوان فاضل نے تیز وتند مقالہ پیش کیا، جس میں تبدیلیوں کے مشورہ کے ساتھ ساتھ موجودہ نظام پر تیکھی تنقید بھی کی گئی تھی، راقم الحروف اگرچہ درسِ نظامی کے مروجہ نصاب ونظام میں جزوی تبدیلی کا قائل ہے؛ لیکن اس مقالہ میں دیے گئے مشورے اور خاص کر ان مشوروں کا لب ولہجہ ناگوارِ خاطر ہی ہوا، حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ نے اس موقع پر اپنے خطاب میں اس پر رد کرنے کا فریضہ انجام دیا، **فجزاہ اللہ خیر الجزاء.**

مولانا کی زندگی کا ایک اہم پہلو شعروسخن کا اعلیٰ ذوق ہے، یوں تو ہندوستان کے بڑے بڑے علماء ومشائخ نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے؛ لیکن زیادہ تر ان کے کلام میں نصح وموعظت اور تصوف کے معارف کو سادہ طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، ایسے لوگ کم ہیں؛ جن کے یہاں شعری لطافت، تخیل کی بلند پروازی، دل آویز تشبیہات، اور دل کو چھو لینے والی تعبیرات پائی جاتی ہوں، مولانا ریاست علی صاحبؒ کے اشعار میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں، وہ ایک عام مضمون کو بھی خوبصورت تشبیہات کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جیسے آج کل حکومتیں اور جماعتیں اپنے کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہیں

اور کچھ خوشامدی لوگ ان کی تعریف میں زمین کے قلابے آسمان سے ملادیتے ہیں، مولانا نے کس خوبصورتی کے ساتھ اس پر طنز کیا ہے:

شہادتِ گل و بلبل بہت ضروری ہے
کوئی ہزار پکارا کرے : بہار آئی

کسی بات کو بیان کرنے کے لیے پروانوں کا ذکر تو خوب ہوتا ہے؛ لیکن اصل قربانی خود شمع کی ہے، جو اپنے آپ کو جلاتی اور گھلاتی ہے، اس بے چاری کا ذکر نہیں ہوتا اور جو ظاہری کردار ہیں، ان کو شہرت دی جاتی ہے، آپ نے اس پس منظر میں کہا ہے:

تاب و تبِ پیہم کی پتنگے کو خبر کیا؟
خود شمع کے جلووں نے بنایا ہے یہ کردار

بعض ایسے مضامین جن کو اُردو شاعری کے اساتذہ شعراء نے اپنے اشعار میں باندھا ہے، مولانا نے اس کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے اشعار میں پیش کیا ہے، جیسے مرزا اسداللہ غالبؔ کا یہ شعر زبان زد خاص وعام ہے:

وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مولانا نے مہمان کی توقیر اور اس کی آمد پر خوشی واظہار مسرت کے مضمون کو اس طرح باندھا ہے:

نادم ہوں واقعی کرمِ بے حساب سے
خوش آمدید ! آپ کہاں، میرا گھر کہاں؟

اس شعر میں ''کرمِ بے حساب'' کے الفاظ سے مہمان کا شکریہ، ''خوش آمدید'' سے اس کا استقبال کرنا اور ''آپ کہاں میرا گھر کہاں'' سے مہمان کی توقیر نیز اپنی طرف سے تواضع کا اظہار ہے، گویا ایک مہمان کی آمد پر جو باتیں ہونی چاہئیں، وہ سب اس میں جمع ہوگئی ہیں۔

اُردو شاعری میں ''مومن'' کا جو بلند مقام ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، ان کا یہ شعر نزاکتِ خیال کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اسی لیے اُردو دنیا میں اس کو جو قبولیت وپذیرائی حاصل ہوئی ہے، وہ کم اشعار کو حاصل ہوئی ہے:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اگرچہ سلاست وروانی میں اب بھی مومنؔ کے شعر کا جواب نہیں؛ لیکن اس خیال کو مولانا نے بھی بڑی خوبصورتی سے شعر کا پیکر دیا ہے، فرماتے ہیں:

تب کھلا ! آپ ہیں شریکِ سفر
مرے ہمراہ کوئی جب نہ ہوا

مولانا کے اشعار میں تغزل کا رنگ نمایاں ہوتا ہے اور بات ایسے طور پر کہی جاتی ہے جو مضرابِ احساس کو چھیڑ دے۔

عام طور پر اُردو شاعری میں کچھ تو وہ اساتذہ ہیں، جنھوں نے اپنا خاص اُسلوب قائم کیا ہے، کچھ وہ ہیں جنھوں نے نمائندہ شعراء کی پیروی کرنے اور ان کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلہ میں غالبؔ، میرؔ اور اقبالؔ کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی اور بہتوں نے ان کی پیروی کی کوشش کی؛ لیکن ایک شخص بیک وقت کئی شعراء کے اُسلوب کو ساتھ لے کر چلے اور مختلف لب ولہجہ میں اپنے اشعار کہے، یہ آسان نہیں ہوتا، مولانا مرحوم کو اللہ نے اس غیر معمولی صلاحیت سے نوازا تھا، جیسے میرؔ کے لب ولہجہ میں کہتے ہیں:

رُت بدلے گی، پھول کھلیں گے، جام مجھے چھلکانے دو
جام مجھے چھلکانے دو، کونین کو وجد آجانے دو
تم بن رین اندھیری، دُور تلک سناٹا ہے
ایک میرا دل ہے پیاسا اور میرے پیمانے دو
ذرہ ذرہ سینہ کھولے، تیری طرف کیوں لپکے ہے
ہم بیچاروں کی بھی سن لو، ہم کو وہاں تک آنے دو

ان اشعار میں اس خوبی ومہارت کے ساتھ میرؔ کے لب ولہجہ اور ان کی زبان کو اختیار کیا گیا ہے کہ اگر اُردو شاعری کے کسی رمز شناس کو شاعر کا نام معلوم نہ ہو تو عجب نہیں کہ وہ اس کو میرؔ ہی کے اشعار سمجھ لے۔

اسی طرح یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کسے نسبت ہے چشمِ معتبر سے
حذرائے دل ! جہانِ کم نظر سے
منور ہے حریمِ زندگانی
گدازِ شام سے، آہِ سحر سے

اگر آپ کو معلوم نہ ہو کہ یہ مولانا ریاست علی بجنوری صاحبؒ کے اشعار ہیں تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اقبالؔ کے اشعار نہیں ہیں، وہی شکوہِ الفاظ، وہی جوش وخروش اور وہی لب ولہجہ میں وقار و تمکنت۔

مولانا کی شعری خدمات کا ایک شاہکار دارالعلوم دیوبند کا ترانہ ہے، جس میں ایک طرح سے دارالعلوم کی پوری تاریخ آ گئی ہے، اس میں اس خواب کی طرف بھی لطیف اشارہ کیا گیا ہے، جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دارالعلوم دیوبند کی بنیادی عمارت نودرہ کی نشاندہی کی تھی:

خود ساقیِ کوثر نے رکھی، میخانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے، دیوانوں کی روداد یہاں

ترانہ کے اشعار میں جو صوتی آہنگ اور شکوہِ الفاظ مطلوب ہے، وہ اس ترانہ میں بھرپور طریقہ پر پایا جاتا ہے اور مجازؔ لکھنوی کے ترانۂ علی گڑھ سے کسی طرح کم نہیں، مولانا نے ظفرؔ تخلص اختیار کیا تھا اور آپ کا مجموعۂ کلام ''نغمۂ سحر'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، یادش بخیر، جس سال ہم لوگ دورۂ حدیث میں تھے، اسی سال غالباً اس پر اتر پردیش اُردو اکیڈمی سے ایوارڈ بھی ملا تھا، مولانا کا حق ہے کہ کوئی صاحبِ حوصلہ اپنی پی، ایچ، ڈی کے لیے آپ کی ادبی خدمات کا موضوع اختیار کرے، وباللہ التوفیق۔

اس حقیر کا کوئی سبق ان کے پاس نہیں تھا؛ اس لیے براہِ راست ان سے استفادہ کا موقع نہیں ملا اور کم آمیزی کے مزاج کی وجہ سے زمانۂ طالب علمی میں زیادہ آمد ورفت بھی نہیں رہی؛ لیکن بعد میں جب بھی دیوبند جانا ہوتا، آپ کے یہاں حاضری ہوتی، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے قیام کے بعد اس کے پہلے سالانہ جلسہ میں راقم نے حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی دامت برکاتہم اور مولانا ریاست علی بجنوریؒ کو دعوت دی تھی، انھوں نے دعوت قبول کی اور تشریف لائے، اس وقت معہد بالکل ابتدائی حالت میں تھا، راستے نہایت ہی ناہموار تھے، قرب وجوار میں کوئی آبادی نہیں تھی، پڑوس میں ایک عصری تعلیمی ادارہ تھا، وہیں سے بجلی لی جاتی تھی، اتفاق سے اتنی شدید بارش ہوئی کہ راستہ آمد ورفت کے لائق نہیں رہا، دونوں بزرگوں کا قیام میرے غریب خانہ پر میری ذاتی لائبریری کے ہال میں رہا، صرف ایک دفعہ معہد لایا گیا، جس کی اس وقت صرف ایک منزل تھی، اسی کے ایک ہال میں طلبہ کا قیام تھا اور ایک ہال کھانے کے لیے تھا اور ایک ہال میں چھوٹی موٹی لائبریری بھی تھی، لائبریری کے ہال میں دونوں بزرگوں کے محاضرات ہوئے، اگلے دن شہر میں جلسۂ عام ہوا اور ان بزرگوں کے

ہاتھوں فارغین میں اسناد تقسیم کی گئیں، جلسہ میں شہر کے پڑھے لکھے لوگوں اور ذمہ دارانِ مدارس کی بڑی تعداد موجود تھی۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کے استقبال اور قیام کا معقول انتظام نہیں ہوسکا؛ لیکن انھوں نے اپنی خوش اخلاقی اور خورد نوازی سے مجھے اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہونے دیا، مولانا ریاست علی صاحبؒ بار بار اس حقیر اور معہد کے اساتذہ وطلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، خاص طور پر فرمایا: مجھے یہاں کی دو باتیں بہت پسند آئیں، ایک: افراد سازی، دوسرے: سلیقہ شعاری، کہنے لگے: یہاں جو اساتذہ پڑھا رہے ہیں، یا جو طلبہ پڑھ رہے ہیں، وہ بیشتر میرے شاگرد رہ چکے ہیں؛ لیکن یہاں میں نے ان کے جو تحقیقی مقالات دیکھے، وہ غیر معمولی ہیں اور ان کے اندر یہ صلاحیت تربیت کے ذریعہ پیدا ہوئی ہے، سلیقہ شعاری کے بارے میں کہا کہ: میں نے دیکھا کہ لائبریری کے نظام سے لے کر طلبہ کا پروگرام، جلسہ کا دعوت نامہ اور شہر میں منعقد ہونے والا سالانہ جلسہ ساری چیزوں کو ایک خاص سلیقہ سے انجام دیا گیا اور کہیں کوئی بھونڈا پن نظر نہیں آیا، مولانا نے ''کتاب الرائے'' میں بھی اسی تاثر کا اظہار فرمایا۔

خدا کرے مولانا نے جس حسنِ ظن کا اظہار کیا، وہ واقعی ادارہ کے خدام میں موجود ہو؛ لیکن بالکل ابتدائی دور میں ان کی اس حوصلہ افزائی نے ہمارے حوصلوں کو مہمیز کیا؛ اس کے بعد سے مولانا کی شفقت بڑھتی گئی، جہاں بھی ملتے، بڑی محبت سے ملتے، شفقت سے پیش آتے، غائبانہ بھی ذکر خیر کرتے اور دارالعلوم سے فارغ ہونے والا کوئی طالب علم معہد میں داخلہ کے لیے مشورہ کرتا تو اس کی تائید کرتے، یہ ان کی بڑائی اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت تھی، جسے سیکھنے کی ضرورت ہے!

علم وادب کا یہ بلبل خوشِ نوا مورخہ: ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء کو گلشنِ قاسمی کو رنجیدہ وافسردہ چھوڑ کر رُخصت ہوگیا؛ لیکن ہزاروں شاگردوں کے دلوں میں وہ آج بھی زندہ ہے اور سدا زندہ رہے گا۔

اللّٰھمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَتَقَبَّلْ حَسَنَاتِهِ وتَجَاوَزْ عَنْ سَيِّئَاتِهِ.

(۸؍شوال ۱۴۳۸ھ مطابق ۳؍جولائی ۲۰۱۷ء)

❁ ❁ ❁

تعلیم وتربیت کے مخلص نگہبان، اسلاف کی پاکیزہ روایتوں کے امین

حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ

از: جناب محمد رحیم الدین انصاری
ناظم دارالعلوم حیدرآباد

مجھے حکم ہوا ہے کہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری کے بارے میں کچھ لکھوں، مجھ بے بساط سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ میں اس سلسلے میں موضوع سے پوری طرح انصاف کرسکوں گا، جو کچھ بھی میرا قلم لکھے اس خصوص میں یہی کہوں گا کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

میرا بچپن حیدرآباد کے پرانے شہر میں گذرا ہے اور میری ابتدائی تعلیم بھی پرانے شہر کے سرکاری مدارس میں ہوئی ہے؛ اس لیے میں ایسی زبان نہیں لکھ سکتا جس میں چشمِ شریں کا زیروبم ہو یا شبنم کا رقصِ نم، اس میں آپ کو نہ تتلی کا رقص ناز نظر آئے گا، نہ غزالہ کا حسنِ رم، نہ الفاظ میں موتی کی آب ملے گی نہ بیان میں گل کی مہک، مجھے اپنی بے بضاعتی اور ہیچ مدانی کا پوری طرح احساس ہے۔

اب جب کہ قرعۂ فال میرے نام پر ہو تو اس کا فرض چکانا ہی پڑے گا، اور مجھے اتنا تو بتانا ہی پڑے گا کہ حضرت مولانا ریاست علی بجنوری علیہ الرحمہ کون تھے، کیا تھے، کیسے تھے اور کیا کیے؟

آپ ایک سچے معلم ومدرس تھے، خود ان کی شخصیت ان کے اسلوب درس کی طرح مختلف پھولوں کے عطر کا مجموعہ، اہل دل کے دلوں کی تپش، شبوں گداز، شعروادب کے قلم کا ساز، اہل فکر وعمل کا ذوقِ جستجو اور مجاہدین کی روح عمل یہ سب کچھ ان کی ذات میں اس طرح جمع ہوگیا کہ ان کی شخصیت سب سے منفرد اور سب سے ممتاز ہوگئی تھی، اس میں جامعیت بھی تھی اور اعتدال بھی، جمال بھی تھا اور کمال بھی۔

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

مبدأ فیاض نے ممدوح مکرم کو بیشمار کمالات وخوبیوں سے نوازا تھا، وہ جہاں ایک متبحر صاحبِ نظر عالم، دیدہ ور فقیہ، عظیم محدث ومفسر، صاحبِ طرز ادیب، بے مثال معلم ومدرس اور بلند پایہ شاعر تھے، وہیں عملی دنیا میں زہد وتقویٰ، انابت اِلی اللہ، تواضع وانکساری، حلم وبردباری، بے نفسی وخداترسی، رحم دلی وہمدردی جیسی عظیم ملکوتی صفات ان کی ذات میں اس طرح پیوست تھی جیسے گلوں میں خوشبو، آفتاب میں روشنی، بندگانِ خدا سے الفت ومحبت، ہمدردی وکرم گستری، آں محترم کی طبیعت اور دونوں جہانوں میں ان کی کامیابی کی سرخروئی کی فکر وتڑپ، بے تابی وبے قراری فطرت بن گئی تھی۔

مولانا کی شخصیت ہشت پہل ہیرا تھی انھوں نے بہت سی خصوصیات اور کمالات کو اپنے اندر جمع کرلیا تھا، حب نبوی ﷺ میں مولانا ہمیشہ سرشار رہتے، کھانے پینے میں، لباس اور وضع قطع میں سنتوں کا خیال فرماتے، میں نے کبھی انھیں کسی کی غیبت کرتے ہوئے نہیں سنا، اور نہ اپنے سامنے کسی کی غیبت کرنے دیتے، وعدہ خلافی کا تو خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، مولانا کی شاعری پر عشق رسالت مآب ﷺ کی مہر لگی ہوئی تھی۔

کوئی عالم، مصنف، اہل قلم، داعی، فقیہ، محدث، قائد دینی، مصلح اجتماعی، خواہ کتنا ہی قد نکالے محض علم واطلاع کے بل بوتے پر اور صرف ذہانت وذکاوت، عقل وعبقریت، دور نگاہی وروشن خیالی کے سہارے اپنے کام میں برکت کا نور، مقبولیت کی سحر کاری وقدر افزائی اور پسندیدگی کی جاذبیت پیدا نہیں کرسکتا، اگر اس کے کام کا خمیر خون جگر، نور تقویٰ، تب وتاب اخلاص، بیتابیِ عشق رسول، سرشاریٔ محبت الٰہی، لذت سحر خیزی، ذوق عبادت اور شوق ریاضت سے نہ اٹھا ہو، یہی وہ چیز ہے جو کسی عمل کو صاحبِ عمل کے لیے اور خلقِ خدا کے لیے ذریعۂ فائدہ رسانی اور باعث حیات جاودانی بنادیتی ہے۔

واقف ہو اگر لذت بیداری شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پُر اسرار

مذکورۃ الصدر صفات کی حامل وہ ذات گرامی کون ہے، جی ہاں، وہ مجسم عبادت وریاضت، زہد واستغناء اور خوفِ آخرت اور خشیت الٰہی کا پیکر، صلاح وتقوے کا ماہتاب، اسلاف کی پاکیزہ روایتوں کا امین، جادۂ عشق ووفا کا بے باک پاسبان، سرمایہ تعلیم وتربیت کا مخلص نگہبان اور ہمہ گیر شخصیت حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کی ذات گرامی تھی۔

متعدد بار راقم الحروف کو مولانا محترم کی مجلسوں میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے،

راقم الحروف کی دعوت پر مولانا مرحوم دارالعلوم حیدرآباد کے جلسۂ ختم بخاری شریف وتکمیل حفظ قرآن مجید میں بھی تشریف لا چکے ہیں۔

مولانا کی نجی محفلیں ہوں یا پند ونصائح کی محفلیں جب زبانِ حق بیان کھلتی تو وہ علمی جواہر پارے بکھیرتے کہ آنکھیں خیرہ اور دل ششدر رہ جاتے، اہل شعور کہہ اٹھتے۔

علومِ دین پر اللہ اکبر اتنی قدرت ہے
زباں میں کوثر وتسنیم کی شامل حلاوت ہے

جس طرح ذہانت وفراست اور تعلیم وتعلم میں مولانا کی ایک انفرادی شان تھی اسی طرح شعروشاعری میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے؛ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کا ترانہ اس کی اعلیٰ ترین مثال ہے، اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ کے پاس آنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ آنحضور ﷺ مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں، یہی حال حضرت مولانا کا تھا آنے والے سے مسکرا کر ملتے تھے، اس کی تواضع فرماتے تھے، مولانا محترم کی پوری زندگی ورع وتقویٰ، عزم واستقلال اور زہدواستغناء سے عبارت تھی، دنیا اور متاعِ دنیا کی طرف کبھی آپ کی نگاہ نہیں اٹھی، مال ودولت، جاہ ومرتبہ کی ذرا بھی محبت آپ کے دل میں نہیں تھی۔

رفقاء اور ہم عصروں کا اکرام

انسان کی عظمت وبزرگی اور اس کے قد کی بلندی کا راز یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنے بزرگوں کے تقدس اور ادب واحترام کے پاس ولحاظ کو سعادت اور خوش بختی تصور کرتا ہے، اسی طرح اپنے چھوٹوں پر شفقت ومحبت، رحم دلی ومہربانی کی فرحت بخش چادر ڈال کر ان کی تعمیر وترقی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے، جناب موصوف کی تمام مجلسوں میں انسانیت کی یہ صفت نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی، وہ اپنے ہم جنسوں اور رفقاء سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے، عام آدمی کے ساتھ بھی آپ کا رویہ انتہائی کریمانہ ہوتا تھا، اس کے کیف آگیں لمحات پر اظہارِ مسرت کے ساتھ نامساعد حالات پر دل گرفتہ اور بے قرار ہوجاتے تھے، اور بلا امتیاز تمام انسانوں کے تابناک مستقبل کے لیے ہمیشہ فکر مند اور بے تاب نظر آتے تھے۔ مہمان نوازی میں پورے دارالعلوم دیوبند میں اُن کا کوئی مثیل نہیں تھا، اُن کی مہمان نوازی کو دیکھ کر عربوں کی مہمان نوازی کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، افراد چاہے کتنے ہی ہوں وہ تواضع میں فرق آنے نہیں دیتے، حتی کہ مقروض ہوکر بھی مہمان نوازی کا حق ادا فرماتے تھے، مہمان نوازی کی اسی اعلیٰ وصف کی وجہ شاید اللہ تعالیٰ نے انھیں خادم الحرمین الشریفین کا مہمانِ خصوصی

بنا کر اپنے دربار میں بلایا اور مولانا علیہ الرحمہ حج مبرور سے بہرہ ور ہوئے۔

بہت جی لگتا تھا صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے

بلند پایہ محقق ومصنف

اردو زبان وادب کے حوالے سے موصوف ان مسلم محققین کے زمرے میں شامل ہیں جن کی تحریر فصاحت وبلاغت، لطافت وجاذبیت، دلکشی ورعنائی کے لحاظ سے امتیازی شناخت رکھتی ہے، آپ کا صاف ستھرا اعلیٰ ادبی ذوق، فکر کی گہرائی، تخیل کی بلند پروازی، قلب کا سوزِ دروں وہ عطیہ الٰہی ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا، آپ نے خداداد لیاقت وصلاحیت، مطالعہ کی وسعت، علم کی گہرائی وگیرائی کے ساتھ ساتھ خیال کی ندرت وانفرادیت، جملوں کی فصاحت، الفاظ کی بلاغت، جاں نواز متنوع پیرایۂ بیان، اسلوب کی طرح داری، طرزِ ادا کی جادو بیانی، خوبصورت تشبیہات اور عمدہ استعارات سے مرقع تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کردیا کہ تحریر وتقریر کے میدان میں زبان وقلم کے اصول وضوابط اور اس کے اسرار ورموز کے مولانا علیہ الرحمہ شناور تھے؛ چنانچہ ان کی مؤلفہ کتاب ''ایضاح البخاری'' اس کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

حضور اکرم ﷺ سے صحابہ اکرامؓ نے سوال کیا کہ سب سے اچھا آدمی کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَحَسُنَ عَمَلُہٗ (جس کی عمر لمبی ہو اور اعمال نیک ہو) حضرت مولانا ریاست علی بجنوری علیہ الرحمہ کو اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزیں عطا فرمائی تھیں، مولانا کے اعمال وافعال خلوص وللّٰہیت کے آئینہ دار تھے، انھوں نے اپنی پوری زندگی ایک مردِ مومن کی طرح اور قلندرانہ طریقہ سے گزاری، نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ، نہ عہدے کی طمع نہ دولت کی خواہش اور نہ شہرت کی آرزو، انھوں نے اپنے دامن کو حرصِ دنیا سے آلودہ ہونے نہیں دیا، وہ ہمیشہ حق پسند، حق شناس، حق گو، حق نوشت اور حق سرشت رہے؛ اس لیے وہ ہمیشہ جری اور بے باک بھی تھے، کوئی چیز ان کو حق بات کہنے سے نہیں روک سکتی تھی، وہ لومتِ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے، وہ جس بات کو صحیح سمجھتے اسی کے طرف دار اور علمبردار ہوا کرتے تھے، مولانا علیہ الرحمہ کے اوصافِ حمیدہ بہت ہیں، ان کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ تعصب اور تنگ نظری سے بلند تھے، اعتدال اور میانہ روی ان کے مزاج اور سرشت میں داخل تھی، نہ کسی مسلک سے تعصب نہ کسی ادارے، نہ کسی تنظیم وجماعت کے لیے تنگ دلی اور نہ اس کے خلاف کینہ پروری، یہ وہ صفت ہے جو نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے، ہمارے معاشرے میں اعتدال

پسندی اور میانہ روی کی صفت تقریباً عنقا ہے، حال یہ ہے کہ جو شخص جس ادارے، جس مسلک اور جس تنظیم سے خود کو وابستہ کرلیتا ہے وہی اس کے لیے کامل حق اور صداقت کا معیار بن جاتا ہے، دوسرے ادارے یا تنظیم کی تعریف کرنے اور اس کا اعتراف کرنے کے لیے اس کا ظرف وسیع نہیں ہوتا ہے۔

صبر وشکیبائی کا مظہر

مولانا علیہ الرحمہ کی ممتاز صفات میں ایک اہم صفت گردشِ لیل ونہار کے صبر آزما وحوصلہ شکن مراحل میں صبر وشکیبائی اور حلم وبردباری تھی؛ چنانچہ اہلیہ محترمہ کے انتقال کے بعد راقم الحروف نے بھی ان سے ملاقات کی، مولانا مرحوم نے اس وقت بھی انتہائی صبر وضبط کا مظاہرہ فرمایا، اس کے علاوہ زندگی کے اس سفر میں کیسی کیسی خاردار وادیاں آئیں، مخالفین کی جانب سے طنز وتعریض کی چٹانیں سدِراہ بنیں، ناگہانی امراض کے مختلف جانکاہ طوفان سامنے آئے؛ مگر صبر ورضا کے اس مسافر کے پائے ثبات میں کسی مقام پر بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی، اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں یہ حقیر راقم مکمل اعتماد اور وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ سنگین سے سنگین تر خونچکاں حالات میں جب انسان مایوسیوں کی خوفناک تاریکیوں میں ڈوب کر حواس کھو بیٹھتا ہے، موصوف ان جاں گسل لمحات میں بھی جس طرح صبر وضبط اور تحمل وبردباری سے کام لیتے تھے، تقدیر پر کامل ایمان کے نتیجے میں جس طرح حوادثات سے راضی بہ رضا رہتے تھے، یہ انھیں کا حصہ تھا، عام آدمی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ آپ کی ذات کے نہاں خانے میں رنج والم کے کس قدر جگر خراش طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ متعدد مرتبہ میں نے دیکھا کہ بار بار مخالفین کے ضرر رساں اور اذیت رساں اعمال وکردار سامنے آئے؛ مگر اس حلم وبردباری اور صبر ورضا کے پیکرِ جمیل نے نہ صرف یہ کہ خموشی اختیار کرکے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا؛ بلکہ خلوت وجلوت کی کسی محفل میں بھی حرفِ شکوہ زبان پر آنے نہیں دیا کہ خالق کے علاوہ مخلوق کے سامنے رازہائے دل شکستہ کے انکشافات کو وہ کسی بھی حالت میں سودمند نہیں سمجھتے تھے اور یہی وہ وصف تھا جو آپ کو دیگر اہلِ علم وعمل سے ممتاز کرتا ہے۔

مولانا علیہ الرحمہ کا ایک اور وصف جو بہت کم کسی میں پایا جاتا ہے وہ مولانا مرحوم کا استغناء ہے، حضرت سہیل بن سعدیؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول کریم ﷺ کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتلایئے جو مجھے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اور لوگوں کی نظروں میں بھی محبوب بنادے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''إِزْهَدْ فِي الدُّنْيا يُحِبُّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِيْمَا أَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّوْكَ'' (دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو اللہ تعالیٰ تمہیں

اپنا محبوب بنائے گا اور لوگوں کے مال ودولت سے نظریں پھیر لو تو لوگوں کے نزدیک بھی محبت اور قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاؤ گے۔ ابن ماجہ:۳۰۲) واقعہ یہ ہے کہ زہد واستغناء سے متصف ہوئے بغیر لوگوں کے قلوب متوجہ ہو ہی نہیں پاتے، جہاں ذرا سا لالچ کا شبہ ہوا دینی ودنیوی منصب کی عزت داغدار ہوجاتی ہے اور جب طبیعت میں استغناء ہوتا ہے تو یہی دنیا جس کے لیے در در کی ٹھوکریں کھائی جاتی ہیں، انسان کے قدموں میں آکر گرتی ہیں۔

خدا کے نیک بندوں کو فقیری میں حکومت میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغناء

مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر ایسا محسوس ہوا کہ شاخِ گل سے پھول ٹوٹ کر گر گیا، کوئی مرغ خوش نوا شاخ پر بیٹھا چہچہایا اور اڑ گیا، ایک مردِ صالح رخصت ہوا، انھوں نے بڑی جاں فشانی اور سرگرمی اور خلوص کے ساتھ تادم آخر دارالعلوم دیوبند اور اس کے طلبہ کی خدمت کی تھی، دارالعلوم دیوبند کی تاریخ نامکمل کہلائے گی جس میں حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری علیہ الرحمہ کی خدمات کا تذکرہ نہ ہو، یہ ان کی خدمات ہی کا فیض ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نہ صرف ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں؛ بلکہ سارے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں، افسوس وہ شخصیت اور پُردرد آواز جو نصف صدی تک دارالعلوم دیوبند کی چہار دیواری میں بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

زندگانی تھی تیری مہتاب سے تابندہ تر ❁ خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو تیرا ❁ نور سے معمور یا خاکی شبستاں ہو تیرا

ربِ کریم تو اپنے اس محبوب بندے کو بے پایاں رحمتوں اور نوازشات سے سرفراز فرما، جنت الفردوس میں انبیاء، شہداء وصالحین کی معیت عطا فرما، اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہم لوگوں کو توفیقِ ارزانی نصیب فرما! آمین۔

❁ ❁ ❁

حضرت الاستاذ
مولانا ریاست علی ظفر بجنوری نوراللہ مرقدہٗ کی یاد

تحریر: مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری
مفتی و اُستاذِ حدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

جس وقت دارالعلوم میں صدسالہ عالمی اِجلاس ہوا اور اُس کی افتتاحی نشست میں پوری شان وشوکت کے ساتھ دارالعلوم کا ترانہ:

”یہ علم وہنر کا گہوارہ، تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے
ہر پھول یہاں ایک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے“

پڑھا گیا، تو سننے والا ہر شخص جھوم اُٹھا اور ہر طرف اِس ترانہ کی دھوم مچ گئی، الفاظ کی چست بندش، تاریخ کے تناظر میں معانی کی جامعیت، اَشعار کی صورت میں فکرِ دیوبند کی بھرپور ترجمانی اور دارالعلوم سے وابستہ بلند مرتبہ شخصیات کے پاکیزہ اور برمحل تذکرے نے اِس ترانہ کو جو قبولیتِ عامہ عطا کی، اس کی نظیر نہیں ملتی، ہم جیسے کتنے ہی لوگوں کے حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحبؒ سے تعارف کا ذریعہ یہی ترانہ بنا۔ وہ ہمارا بے شعوری کا زمانہ تھا اور ہم مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ میں زیر تعلیم تھے؛ مگر اسی وقت سے اس ترانہ کے ذریعہ صاحبِ ترانہ سے اُنسیت دل میں پیدا ہوچکی تھی۔ پھر ۱۴۰۲ھ میں جب دارالعلوم دیوبند کی چہار دیواری میں قدم رکھا تو صدسالہ کے بعد بلاخیز طوفان کے بعد دارالعلوم ترقی کی نئی منزلوں کی طرف گامزن تھا، تعلیم سمیت تمام شعبوں میں اصلاحات کا عمل تیزی سے جاری تھا، گویا اِس تاریخی ورثہ کی تزئین وتحسین کا مشن چل رہا تھا، اندازہ ہوا کہ اس مشن میں جن حضرات کو فعالیت کا درجہ حاصل ہے، اُن میں اور حضرات کے ساتھ حضرت مولاناؒ کا کردار بھی خاصا نمایاں تھا۔

دارالعلوم میں طلبہ کی انجمنیں اُن کی صلاحیتیں نکھارنے میں اہم کردار اَدا کرتی ہیں، اُن میں

''مدنی دارالمطالعہ'' اپنی الگ شان رکھتا ہے، دارالعلوم میں اس کی ذمہ داری جب رفیقِ محترم مولانا معزالدین احمد (حال ناظم امارتِ شرعیہ ہند) اور اِس ناکارہ کے سرآئی، تو اُس کے سرپرستوں میں حضرت الاستاذ بھی شامل تھے، اِس بہانے حضرت کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضری ہونے لگی، حضرت والا مدنی دارالمطالعہ کی سرگرمیوں میں خوب دلچسپی لیتے اور اُس کے پروگراموں پر دل کھول کر حوصلہ افزائی فرماتے۔

ایک مرتبہ ہم لوگوں نے حضرتؒ کی صدارت میں ''ردِمودودیت'' پر دارالحدیث تحتانی میں ایک خصوصی پروگرام منعقد کیا، حضرت ازاوّل تا آخر شریک رہے اور بہت زیادہ پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اِس ضمن میں ایک واقعہ ہم لوگ کبھی بھول نہیں سکتے؛ ہوا یہ کہ ''مدنی دارالمطالعہ'' کے سالانہ اختتامی اجلاس میں ایک سال کافی تاخیر ہوگئی، رجب کا مہینہ شروع ہوچکا تھا اور طلبہ کی توجہ امتحان کی تیاریوں کی طرف ہوگئی تھی، ایسے میں اجلاس کو کامیاب بنانا اور طلبہ کی شرکت کو یقینی بنانا بڑا دشوار تھا، اِس لیے ذہن میں یہ بات آئی کہ مکالمہ کا کوئی ایسا دلچسپ پروگرام رکھا جائے جو طلبہ کی رغبت کا سبب بن سکے؛ چناں چہ ایسے ہی ایک مکالمہ کی تاری کرلی گئی اور اعلان کردیا گیا، مخدوم محترم حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحبؒ مہمانِ خصوصی تھے، اجلاس میں دیگر پروگراموں کے ساتھ بڑا دلچسپ مقالمہ بھی پیش ہوا، جو ''مفتی اور مستفتی'' پر مشتمل تھا؛ مگر مکالمہ ختم ہوتے ہی شریک طلبہ جلسہ سے اُٹھ کر چل دیے اور دارالحدیث فوقانی آدھے سے زیادہ خالی ہوگئی اور ایک عجیب وغریب صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ اَناؤنسر نے اِسی دوران حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحبؒ کے نام کا اعلان کیا، حضرت مائک پر تشریف لائے اور مختصر خطبہ کے بعد بھرپور خطابی اُسلوب میں یہ جملہ فرمایا: ''میں کیا کہوں، جن سے کہنا تھا وہ تو جاچکے'' یہ جملہ کچھ ایسے پراثر انداز میں آپ نے فرمایا کہ باہر نکلنے والے جس طالب علم کے کان میں پڑا وہ فوراً واپس لوٹ آیا اور پھر دارالحدیث بھرگئی، اس کے بعد آپ نے اور آپ کے بعد صدر اجلاس حضرت الاستاذ مولانا سیّد ارشد مدنی صاحب مدظلہٗ نے ڈرامائی مکالموں پر سخت تنبیہ فرمائی اور اس طرز کے مفاسد بیان فرمائے۔ اس کے بعد سے مدنی دارالمطالعہ کے پروگراموں میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ کوئی بات اکابر کے طریقہ کے خلاف نہ ہو۔

۱۴۰۹ھ سے ہمیں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی میں خدمت کا موقع ملا؛ تاہم دیوبند آتے جاتے وقت حضرت الاستاذ سے راہ ورسم برقرار رہی، جب بھی ملاقات ہوتی نہایت مسرت کا اظہار فرماتے اور فرماتے کہ: ''تمھیں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے''۔ ایک مرتبہ مدرسہ شاہی کے آٹھ سالہ اجلاس

دستار بندی میں آپ کو دعوت دی گئی، شاہی مسجد میں اجلاس جاری تھا، نظامت احقر کے سپرد تھی، ایک واعظ صاحب نے دورانِ بیان سیرت کا ایک واقعہ بیان کیا، جو بظاہر غیر مستند تھا۔ ایک ساتھی کے توجہ دلانے پر احقر نے اپنی حماقت میں اُن کے بیان کے بعد اس واقعہ کی برملا تردید کردی، جو بہر حال اس انداز میں مناسب نہ تھی۔ (اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں) حضرت والا مجلس میں موجود تھے اور اگلا بیان آپ ہی کا تھا، آپ نے بیان کا آغاز کچھ اس طرح فرمایا کہ: ''میرے لیے اِس ماحول میں تقریر کرنا مستقل امتحان ہے، جہاں تقریر کے ساتھ لگے ہاتھوں تصحیح بھی ہورہی ہو'' پھر آپ نے مشفقانہ انداز میں نصیحت کی کہ کسی بات کی تردید اور تصحیح میں بھی نرم پہلو پیش نظر رہنا چاہیے کہ دوسرے کو ناگوار نہ گذرے۔ حضرت کی اس نصیحت سے احقر مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا اور بعد میں مذکورہ واعظ صاحب سے ندامت کے ساتھ بہت معذرت کی اور موصوف نے بھی بڑائی کا ثبوت دیتے ہوئے دل سے معاف کردیا، اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر سے نوازیں!

آپ ''ندائے شاہی'' کے مستقل قارئین میں شامل تھے؛ بلکہ پابندی سے اس کا زرِ سالانہ بھی باصرار ادا فرماتے تھے۔ احقر اپنی کوئی تالیف پیش کرتا تو اس کی بھی بڑی قدر فرماتے اور اس کا مطالعہ بھی فرمایا کرتے تھے، کئی تالیفات پر آپ نے گراں قدر تقریظ بھی لکھ کر مرحمت فرمائی، جو احقر کے لیے باعثِ فخر وسعادت ہے۔

حضرت والا گوناگوں اَوصاف وخصوصیات سے متصف تھے، بالخصوص سادگی، اِنسانی ہمدردی، حلم وبردباری، وقار وخودداری میں اپنے ہم عصروں میں خاص امتیاز کے حامل تھے اور تواضع تو آپ کی طبیعت میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ آپ سے ملنے والا آپ سے پہلی ہی ملاقات میں بآسانی محسوس کرلیتا تھا، کسی بھی معاملہ میں اپنا امتیاز آپ کو طبعًا پسند نہ تھا؛ بلکہ اس سے بڑی کوفت ہوتی تھی، قادرالکلام خطیب ہونے کے باوجود آپ وعظ وخطابت سے حتی الامکان گریز فرماتے تھے۔ کوئی شاگرد بہت ہی تقاضا کرتا تو اُس کی دل داری کی خاطر پروگرام میں شرکت منظور فرمالیتے تھے؛ لیکن گفتگو مختصر، پرمغز اور جامع فرماتے تھے، جو حشو وزوائد سے پاک ہوتی تھی۔

یہی حال آپ کے درس کا بھی تھا، آپ جو بھی کتاب پڑھاتے، اُس کا پورا حق اَدا کرنے کی کوشش فرماتے تھے اور درس کا انداز ایسا پیارا اور دل موہ لینے والا ہوتا تھا کہ ہر طالب علم آپ سے قریب اور مانوس ہوجاتا اور آپ کی گفتگو سے محظوظ ہوتا تھا۔

عصر کے بعد آپ کے یہاں عام مجلس لگتی تھی، جس میں ہر شخص کو شرکت کی اجازت تھی، حاضرین

کی جائے سے تواضع کی جاتی، ہلکی پھلکی ظرافت سے آپ کی مجلس زعفران زار بنی رہتی تھی، حالاتِ حاضرہ پر آپ کے برمحل اور بروقت بے تکلف تبصروں سے حاضرین خوب لطف اندوز ہوتے۔

فہم وفراست اور ذکاوت آپ کے چہرے بشرے سے عیاں تھی، اِصابتِ رائے اور فکر کی پختگی ایسی تھی کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، وہ آپ کو مرعوب نہ کرسکتا تھا۔ مردم شناسی بھی بلا کی تھی، کسی آدمی کے صرف ظاہر کو دیکھ کر آپ کبھی متاثر نہ ہوتے، خوشامد اور چاپلوسی کا آپ کی زندگی میں گذر نہ تھا، محض مال کی وجہ سے بڑے سے بڑے سرمایہ دار کا خاص اکرام کرتے ہوئے آپ کو نہیں دیکھا گیا۔ اس کے برخلاف اہلِ صلاح اور اہلِ علم کی تعظیم اور قدر دانی میں کوئی کمی نہ فرماتے؛ بلکہ اُن کی خدمت میں نیازمندانہ حاضر ہوتے تھے۔

حضرت والا کا خاص کر اپنے چھوٹوں اور شاگردوں کے ساتھ عجیب وغریب شفقت کا معاملہ تھا، اُن کی دینی خدمات اور سرگرمیوں پر دل کھول کر شاباشی دیتے اور بالکل ایک حقیقی باپ کی طرح مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔ اکثر آپ کے شاگرد اپنی تالیفات پر آپ سے تقریظ لکھوانے کے متمنی رہتے تھے؛ چناں چہ آپ حوصلہ افزائی کی خاطر کسی شاگرد کی درخواست کو رد نہ فرماتے اور نہایت نپے تلے انداز میں تقریظ تحریر فرماکر ہمت افزائی کرتے تھے۔ بلاشبہ سیکڑوں کتابوں اور رسائل میں آپ کی تقریظات شائع شدہ ہیں۔

اجتماعی معاملات میں آپ ہمیشہ اِدارے کا مفاد مقدم رکھ کر مشورے دیا کرتے تھے؛ چناں چہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری نوراللہ مرقدہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اہم معاملات میں آپ سے مشورے لیتے تھے اور آپ کی رائے کو وقعت دیتے تھے۔ موجودہ انتظامیہ کے ساتھ بھی آپ کا رویہ ناصحانہ اور خیرخواہانہ تھا۔

اکابر واسلاف کے فکر پر آپ مضبوطی سے قائم تھے اور جادۂ حق سے معمولی انحراف بھی آپ کو پسند نہ تھا۔

جمعیۃ علماء ہند اور اُس کی فکر سے آپ بچپن سے وابستہ رہے؛ تا آں کہ عمر کے آخری دس سالوں میں جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی نائب صدر کے منصب پر بھی فائز رہے۔ اور جب ''مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند'' کے فقہی اجتماعات کا سلسلہ شروع ہوا، تو جب تک صحت رہی اُن کی نظامت کی ذمہ داری آپ کے سپرد ہوتی تھی، جسے آپ پوری کامیابی سے انجام دیتے تھے۔

آپ کو شعر واَدب کا اصاف ستھرا ذوق بھی عطا ہوا تھا، جو آپ کی فطری ذہانت وذکاوت سے

ہم آہنگ تھا، جس کو اُستاذ الشعراء حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمیؒ کی رفاقت نے دوآتشہ بنادیا تھا؛ چنانچہ آپ کے قلم سے ایسے بلند پایہ پاکیزہ اَشعار صادر ہوئے جو زبان زدِ خاص وعام ہوگئے۔ بالخصوص دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کا بہترین ترانہ آپ کی یادگار ہے، اُن کے علاوہ آپ نے جو نعتیں یا غزلیں لکھیں، اُن سے آپ کی فکری لطافت اور حسن ذوق کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سب تخلیقات ''نغمۂ سحر'' کے نام سے ۱۴۴ر صفحات پر مشتمل کتاب میں شائع کردی گئی ہیں۔ باذوق حضرات اُس سے محظوظ ہوسکتے ہیں۔

زندگی میں عام طور پر آپ صحت مند رہے، گٹھے ہوئے بدن اور چست اور جفاکش طبیعت کے مالک تھے؛ لیکن اخیر میں شوگر کے عارضہ نے جسم کو گھلا کر رکھ دیا تھا، اِسی کے ساتھ قلب اور گردے بھی شدید متأثر ہوگئے تھے۔ بالآخر یہی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی اور آپ نے ۲۳ر شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰ر مئی ۲۰۱۷ء بروز ہفتہ بوقت سحر داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنی حسنات لے کر بارگاہِ رب العالمین میں حاضر ہوگئے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ اُسی دن بعد نماز ظہر امیر الہند حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری مدظلہٗ صدر جمعیۃ علماء ہند واُستاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی اقتداء میں احاطۂ مولسری میں آپ کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور مزار قاسمی میں نم آنکھوں سے آپ کو سپرد خاک کیا گیا، عوام وخواص کا بڑا مجمع شریک جنازہ تھا اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ:

جان کر من جملۂ خاصانِ مے خانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

آپ کے تین صاحب زادے ہیں: مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی، مولانا قاری محمد عدنان صاحب قاسمی مقیم حال شکاگو، امریکہ اور مولانا مفتی محمد سعدان صاحب قاسمی اُستاذ معہد انور دیوبند۔ ماشاء اللہ تینوں دارالعلوم سے فارغ ہیں اور خدمات میں لگے ہوئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کے درجات بلند فرمائیں، متعلقین کو صبر جمیل سے نوازیں اور ہم سب کو آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین!

❁ ❁ ❁

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ
شخصیت کے تشکیلی عناصر

از: مفتی محمد ساجد قاسمی ہردوئی
استاذ تفسیر وادب دارالعلوم دیوبند

پچھلے دنوں ملتِ اسلامیۂ ہند کو جن عظیم شخصیات کی رحلت کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا اُن میں ایک شخصیت استاذِ گرامی مرتبت حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری کی ہے، جو مختصر علالت کے بعد ۲۳ر شعبان ۱۴۳۸ھ = ۲۰ر مئی ۲۰۱۷ء کو دنیا سے رحلت کر گئے۔

آپ کے انتقال سے آپ کے اہلِ خانہ، دارالعلوم دیوبند کے اربابِ انتظام، اساتذہ، طلبہ اور آپ کے متعلقین کو گہرا رنج ہوا۔ یقیناً آپ کی وفات کاروانِ دارالعلوم کے لیے بالخصوص اور ملت اسلامیۂ ہند کے لیے بالعموم ایک ناقابل تلافی خسارہ ہے۔

آپ دارالعلوم کے مؤقر استاذِ حدیث، اس کی نشأۃِ ثانیہ کا ایک اہم دماغ، اس کی روایات کے امین، اس کے منہاج ومزاج سے باخبر اور اس کے مسلک ومشرب کے تئیں بڑے غیور واقع ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ آپ ایک بلند پایہ عالمِ دین، عظیم مؤلف، باکمال شاعر، شرافت ومروت کے پیکر، وقار کا کوہِ گراں، ہمدردی وغمگساری کا مجسمہ، منکسر المزاج، مال ومتاع کے حصول سے بیزار، جاہ ومنصب کی چاہت سے کوسوں دور، فراخ دل، سیر چشم اور ایک سادہ لیکن دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔

کہا جاتا ہے کہ آدمی کی شخصیت کی تشکیل میں موروثی پس منظر، تعلیم وتربیت، گردوپیش کے ماحول اور ذاتی تجربات کا اہم کردار ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخصیت مذکورہ عناصر سے تشکیل پاتی ہے، یہ عناصر جتنے زیادہ صحت مند، حیات افزا اور طاقتور ہوں گے اتنی ہی زیادہ طاقتور شخصیت تشکیل پائے گی۔ جب ہم آپ کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ عناصر آپ کے یہاں ہمیں کچھ اس طرح ملتے ہیں۔

موروثی پس منظر

آپ کے موروثی پس منظر کو لے لیجیے، تو آپ نسبی اعتبار سے ایک شریف خانوادے کے چشم و چراغ تھے، آپ کا سلسلۂ نسب میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے، اور یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ نسبی خصوصیات نسلوں میں منتقل ہوتی ہے۔ آپ کو بھی نسبی خصوصیات سے ایک وافر حصہ ملا ہوا تھا؛ چنانچہ مہمان نوازی و کرم گستری، ہمدردی و غمگساری، شرافت و مروت اور ذکاوت و ذہانت آپ کی نمایاں موروثی صفات تھیں۔

تعلیم وتربیت

والد صاحب کا سایۂ عاطفت بچپن ہی میں آپ کے سر سے اٹھ گیا تھا، آپ کے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب (سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) بغرضِ تعلیم وتربیت آپ کو اپنے ساتھ دیوبند لائے، آپ نے دارالعلوم دیوبند میں آپ کی سرپرستی میں تعلیم کی تکمیل کی اور فرسٹ پوزیشن سے دورۂ حدیث کا امتحان پاس کیا۔

حضرت مولانا سلطان الحق صاحب کے بارے میں جو تذکرے سننے میں آئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ حضرت مدنی کے جاںنثاروں میں تھے، اور آپ کا ایک حلقہ تھا جس سے بہت سے اساتذہ اور طلبہ وابستہ تھے۔ آپ کے فیضِ صحبت اٹھائے ہوئے دارالعلوم کے بہت سے قدیم فضلا آپ کی طلبہ کے ساتھ ہمدردی و خیرخواہی کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا سلطان الحق صاحب کو آپ سے قرابت کا تعلق تھا؛ اس لیے لازمی طور پر انھوں نے آپ کی تربیت پر خصوصی توجہ دی ہوگی۔ اور حضرت مولانا سلطان الحق صاحب کی معیت اور تربیت سے آپ کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے یہاں مجلسی مزاج و مذاق اور طلبہ کے ساتھ ہمدردی اور تعلق داری اسی تربیت کا اثر تھا۔

دارالعلوم میں آپ نے اپنے اساتذہ سے تحصیلِ علم کے ساتھ ساتھ بہت کچھ سیکھا ہوگا، ان میں سے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخرالدین احمد مرادآبادیؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی شخصیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آپ دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد اگلے سال بھی ان کے درس میں شریک ہوکر آپ کی بخاری شریف کی تقریر محفوظ کرتے رہے، جسے آپ نے بعد میں مرتب کر کے ''ایضاح البخاری'' کے نام سے شائع کیا۔

تیسری شخصیت جس کا آپ کی شعری و ادبی زندگی پر بڑا اثر ہے، وہ جناب مولانا محمد عثمان

کاشفؔ الہاشمی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ہے، آپ نے جناب کاشف صاحب سے شعر گوئی کی تربیت حاصل کی تھی۔ آپ اعلیٰ شعری وادبی ذوق رکھتے تھے، آپ اپنے اس ذوق کی بنا پر شاعری کے باب میں اپنے پیش رواکابرِ دیوبند کی صف میں نظر آتے ہیں۔

گردوپیش کا ماحول

آپ نے جس ماحول میں نشوونما پائی، وہ ابتداءً آپ کا خاندانی ماحول اور ثانیاً دارالعلوم دیوبند کا علمی وروحانی ماحول تھا، جو اساتذۂ دارالعلوم (جو بیک وقت اساطینِ علم اور اصحابِ نسبت بزرگ تھے) کے سانسوں سے پُر تھا، ان میں سے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا فخرالدین احمد مرادآبادیؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ اور شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزازعلی امروہویؒ خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اصول پسندی اور وقت کی پابندی، حق گوئی وبیباکی اور بہت سی اچھی عادتیں یقیناً آپ نے اسی ماحول سے سیکھی تھیں۔

ذاتی تجربات

جہاں تک آپ کے ذاتی تجربات کا تعلق ہے تو یقیناً وہ بہت مختلف اور متنوع ہوں گے جو کچھ اس حوالے سے میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ نے یتیمی کی زندگی گذاری اور تنگ دستی اور خوشحالی کے دونوں دور دیکھے ہیں، یتیمی اور تنگ دستی کے دور میں نہ معلوم کتنے ایسے ہوں گے جنھوں نے آپ سے منہ پھیر لیا ہوگا اور خوشحالی کے دور میں بہت سے ایسے بھی ہوں گے جنھوں نے آپ سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش ہوگی۔ آپ نے کئی اداروں میں کام کیا، ان میں نہ معلوم کیسے کیسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہوگا۔ ان تمام چیزوں سے آپ کو یقیناً بہت سے تجربات حاصل ہوئے ہوں گے۔

یہ وہ عناصر ہیں جن سے آپ کی شخصیت تشکیل پائی تھی، اور جن سے آپ ایک ممتاز حیثیت کی حامل شخصیت کہلائے۔

آپ دارالعلوم کی روایات کے امین اور اس کے اصول وضوابط سے پورے طور پر باخبر تھے، جب کبھی آپ کو کسی روایت سے انحراف یا کسی ضابطے کی خلاف ورزی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تو آپ اس کا بلاتکلف اظہار فرمادیتے۔

آپ وقت کے بہت پابند تھے، اسباق کی پابندی کے علاوہ، امتحان گاہ میں بڑی پابندی سے حاضر ہوتے تھے، اگر طبیعت بہت زیادہ ناساز ہوتی تو رخصت کی درخواست بھیجتے تھے۔ ورنہ عام

حالات میں آپ نے امتحان گاہ میں حاضر ہونے کی ہمیشہ پابندی کی۔ طبیعت کی ناسازی کی بنا پر ذمے داروں کی جانب سے اس بار امتحان سالانہ میں آپ کو اس حاضری سے مستثنیٰ بھی قرار دیا گیا، پھر بھی آپ امتحان کے آخری دن تک پابندی سے امتحان گاہ میں آتے رہے۔

عصر کے بعد کی مجلس

عصر کے بعد آپ کی مجلس ہوتی تھی، جس میں بڑی تعداد میں اساتذہ شریک ہوتے تھے، میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ مجلسی ذوق حضرت مولانا سلطان الحق صاحب کے یہاں سے ملا تھا اور آپ کی یہ مجلس ان کی مجلس کا امتداد تھی۔

آپ کی مجلس میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی، کبھی علمی موضوع پر، کبھی حالات حاضرہ پر اور کبھی تفریحِ طبع کی باتیں ہوتیں۔ مجلس میں ہر ایک کو گفتگو، سوال و جواب کی پوری آزادی ہوتی، اور آپ بھی ہر ایک سے بے تکلف رہتے۔ راقم الحروف مجلس میں روزانہ حاضر نہیں ہو پاتا، کبھی ہفتہ دس دن گذر جاتے اور کبھی مہینہ، جب کافی مدت کے بعد حاضری ہوتی تو آپ یہ ضرور معلوم کرتے کہ آج کل کیا کام کر رہے ہو، جب میں اپنی مشغولیت بتاتا تو بہت خوش ہوتے اور حوصلہ افزائی فرماتے۔

خورد نوازی و حوصلہ افزائی

مجلس شوریٰ کی تجویز کے مطابق دارالعلوم کے تعارف میں حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی تالیف کردہ عربی کتاب ,,الهديةُ السَّنيةُ في ذكرِ المدرسة الديوبندية،، کے ترجمہ کا کام راقم الحروف کو سپرد کیا گیا، ناچیز نے اس کا اردو ترجمہ مکمل کر کے شیخ الہند اکیڈمی کے حوالے کر دیا، پھر مجلس نے نظرِ ثانی کے لیے مسودہ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اور حضرت مولانا عبدالخالق سنبھلی دامت برکاتہم کو دیا؛ چنانچہ آپ دونوں حضرات نے اس پر نظر ثانی فرمائی اور ترجمے کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی اصلاح فرمائی۔ پھر آپ نے رپورٹ میں اس ترجمہ کی تصویب فرماتے ہوئے اسے قابلِ اشاعت قرار دیا۔ مجھے آپ کی نظرِ ثانی اور اصلاحات سے کافی فائدہ ہوا اور بڑا حوصلہ ملا۔

عادات و اخلاق

میں نے آپ کو ۱۹۹۱ء سے دیکھا ہے، اس وقت سے انتقال تک آپ کی زندگی کی ایک ہی روش اور ایک ہی انداز دیکھا، یقیناً آپ کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے ہوں گے؛ لیکن آپ کے طور و طریق میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ وقار کا کوہِ گراں تھے، بے نفسی اور تواضع آپ کی نمایاں خصوصیت تھی۔ آج کے اس مادیت کے دور میں لوگ طرح طرح سے مادی منافع حاصل

کرتے ہیں اور دنیوی مال ومتاع حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں حتی کہ طبقۂ خواص میں بھی بہت سے افراد اس وبا سے متاثر معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن آپ کو اس طرح کی تگ ودو سے بہت دور پایا؛ بلکہ ہمیں آپ اس حوالے سے ایک گوشہ نشیں زاہدِ مرتاض نظر آتے ہیں۔ مجھے آپ کی یہ صفت بہت متاثر کرتی تھی۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ آپ کی طرح دنیوی منافع اور مال ومتاع کی طمع سے بالاتر ہوکر اخروی اجر وثواب اور وہاں درجات کی بلندی کے علاوہ دنیا میں اپنے قیمتی وقت کو بچایا جاسکتا ہے اور اسے مفید علمی کاموں میں لگایا جاسکتا ہے۔

سنا ہے کہ آپ کی بعض موروثی جائیداد پر کچھ لوگوں نے ناجائز قبضہ کرلیا تھا، آپ نے اپنے آپ کو اختلاف ونزاع سے بچایا اور اس جائیداد کی بازیابی کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی؛ بلکہ اولاد کو بھی اس طرح کے نزاعات میں پڑنے سے دور رکھا۔

اللہ تعالی نے آپ کو اصابتِ رائے کی صفت سے نوازا تھا، بہت سے معاملات میں آپ سے تعلق رکھنے والے آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ بعض معاملات میں دیکھا کہ آپ نے ایک جملے میں اپنی رائے کا اظہار کردیا۔ بہت سے اہم اور نازک مسائل میں آپ مصلحت کوشی سے بالاتر اور بلاخوفِ لومتِ لائم بڑی بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کردیا کرتے تھے۔ یہ وہی شخص کرسکتا ہے جو مخلص ہو اور جس کا دل ذاتی مفادات کی آلودگی سے پاک ہو۔

اسی طرح آپ بہت سی پریشانی میں مبتلا لوگوں کو ایک جملہ کہہ کر تسلی دے دیا کرتے تھے، اور واقعی آدمی کو تسلی ہوجاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں اپنے بعض مسائل کو لے کر پریشان تھا، آپ کو معلوم ہوا تو ملاقات پر آپ نے ایک تسلی بھرا جملہ فرمایا: ''..بیٹے! محنت کرتے رہو، محنت کرنے والے کا کوئی راستہ روک نہیں سکتا''۔

دارالعلوم دیوبند میں میرے جتنے اساتذہ ہیں، الحمدللہ وہ ایسی خصوصیات وکمالات کے حامل ہیں جو یکجا طور پر دوسروں میں خال خال ہی ملیں گی؛ مگر یہ بات بلاکسی موازنہ کے کہی جاسکتی ہے کہ بعض خصوصیات کے لحاظ آپ منفرد نظر آتے تھے۔

کہتے ہیں لوگ ذوقؔ دنیا سے چل بسا　　　کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

❁ ❁ ❁

ریاستِ علم وادب اور پیکرِ خلقِ عظیم

از: مولانا اشتیاق احمد قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

اولین نصیحت

غالباً ۱۹۹۵ء کی بات ہے، جب دارالعلوم دیوبند میں ناچیز کا داخلہ ہوا، داخلہ کی کارروائیوں کی تکمیل کے بعد افتتاحی اجلاس دارالحدیث تحتانی میں ہوا، اس میں بہت سے اکابر اساتذہ تشریف لائے، اُن میں حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب ظفرؔ بجنوریؒ بھی تھے، آپ نے نہایت مختصر نصیحت فرمائی، سب سے اہم بات اوقات کی حفاظت کی تلقین تھی، آپ نے فرمایا:

''طلبۂ عزیز! آپ اپنے اوقات ضائع نہ کریں، وقت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اسے ضائع کرنا اپنی عمر کو ضائع کرنا ہے، مصروفیات بہت ہوتی ہیں، اگر ان کے لیے اوقات کو مرتب نہ کیا جائے، تو کوئی کام منضبط انداز میں مکمل نہیں ہو پاتا؛ اس لیے آپ اپنے لیے ایک نظام الاوقات بنالیجیے! اس میں ہر کام کا وقت لکھ لیجیے اور کوشش کیجیے کہ اس کے خلاف نہ ہونے پائے تو ان شاء اللہ آپ کے علم میں ترقی ہوگی اور کم وقت میں آپ زیادہ کام کرلے جائیں گے۔''

حضرت کی تقریر سن کر میں نے یہ عزم کرلیا کہ نظام الاوقات ضرور بناؤں گا اور اس کے خلاف نہیں کروں گا؛ چنانچہ میں نے شب وروز کے لیے ایک نظام الاوقات بنایا اور اس کو اپنی نشست گاہ کے قریب دیوار پر چپکا دیا اور دعا کی کہ یا اللہ! مجھے اس کی پابندی کی توفیق عطا فرما! الحمدللہ! اس کی پابندی پورے سال اس انداز سے ہوئی کہ مجھے دارالحدیث، کمرہ اور مطبخ کے علاوہ دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا اور الحمدللہ! سالانہ امتحان میں تیسری پوزیشن سے کامیابی حاصل ہوئی، افتاء اور تدریب افتاء میں بھی اس کی پابندی کی، پھر معین مدرسی کے زمانے میں اس پر اور بھی سخت ہوگیا، اس کی برکت سے بہت سی کتابوں کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع نصیب ہوا۔

اپنی کمیوں، کوتاہیوں کے دور کرنے کا موقع ملا، میں فارسی اور عربی زبان میں بہت کمزور تھا، مقالہ نویسی اور مضمون نگاری سے نابلد تھا، تصنیف وتالیف کے اصول وضوابط سے بے خبر تھا، ان ساری کمیوں کو دور کرنے کا موقع محض حضرت الاستاذ کے چند جملوں کی برکت سے نصیب ہوا، اللہ تعالیٰ حضرت کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں!

ابن ماجہ کا سبق

جب اسباق شروع ہوئے تو ظہر بعد حضرت درس گاہ تشریف لائے اور ابن ماجہ کا سبق شروع فرمایا، پہلے ہی سبق میں حضرت کے سادے اور پُر مغز اندازِ بیان سے دل متأثر ہوا، سب سے زیادہ متأثر کن حضرت کی زبان تھی، سادگی میں ادبی لطافت سے بڑا حظ ملتا تھا، آپ کوئی جملہ شروع کرتے اور ایسا لفظ استعمال کرتے کہ اندازہ ہوتا کہ اس لفظ کو بدل کر ہی جملہ درست ہوگا؛ مگر ایسا ہرگز نہ ہوتا اس کے لیے نئی تعبیر لاتے اور جملہ بہت خوب صورت ہوکر پورا ہوتا۔

ادبی لطافت

زبان وادب میں حضرت الاستاذ کا امتیاز کسی اور میں دیکھنے کو نصیب نہیں ہوا، کلام کی سطح کس طرح بلند اور کس طرح پست ہوتی ہے؟ یہ چیزیں آپ کے لیے کھلونے کی طرح تھیں اور نظم ونثر دونوں میں یکساں تھیں۔

نظم اور شعر میں حضرت کے مقام کا اندازہ کرنے کے لیے ''نغمۂ سحر'' کافی ہے۔ نظم کلام کے موزوں کرنے کا نام ہے اور شعر میں احساسِ لطیف ہوتا ہے؛ اس لیے ہر نظم کو شعر نہیں کہا جاسکتا ہے، آپ شعر کو کبھی کبھی اتنا بلند کردیتے تھے کہ عام قارئین کی سطح سے تو اونچا ہو ہی جاتا تھا، بعض اوقات خواص کے لیے بھی سمجھنا دشوار ہوتا، ایسے اشعار کے سلسلے میں کبھی خود کہتے کہ اس میں ابہام زیادہ ہوگیا ہے، اس کو کچھ واضح کرنا چاہیے۔

کلیاتِ کاشفؔ کی ترتیب کے دوران اس کا خوب مشاہدہ ہوا، خصوصاً ''رباعیات'' میں آپ کے جواہر پاروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس طرح کی عبقری استعداد کے باوجود شعرگوئی سے کنارہ کش رہتے، اس کو اپنے لیے قابلِ فخر نہ سمجھتے تھے، اپنے کلام محفوظ رکھنے کا بھی کوئی اہتمام نہ فرماتے، بہت سے قصیدے، نظمیں اور رخصت نامے جہاں اور جس کے لیے لکھے وہیں چھوڑ دیے، میں نے ایک بار عرض کیا کہ آپ کے اشعار محفوظ ہیں یا نہیں؟ فرمایا: نہیں، میں نے کہا: کیوں محفوظ نہیں رکھتے؟ تو فرمایا: میرے کلام کا انتخاب

''نغمۂ سحر'' میں چھپ گیا ہے، اس کے علاوہ جو کلام ہے اس کی سطح اتنی اونچی معلوم نہیں ہوتی کہ اس کو محفوظ رکھوں اور طباعت کے لیے سوچوں، یہ تو حضرت کی متواضعانہ بات تھی؛ مگر ناچیز کو بعض غیر مطبوعہ نظمیں اور قصیدے ملے ہیں، جو نہایت پاکیزہ اور بلند ہیں۔

نثری ادب میں بھی حضرت کا مقام کافی بلند تھا، عام بول چال میں نہایت سہل؛ بلکہ سہلِ ممتنع بولتے اور لکھتے تھے؛ لیکن جب کبھی کسی ادبی کتاب، کسی شاعر کے کلام پر کچھ لکھنا ہوتا تو زبان نہایت شگفتہ اور ادبی ہوجاتی تھی۔

غزلیہ شاعری سے دلچسپی

حضرت الاستاذ سے ایک بار سوال کیا کہ آپ کو کس صنف کی شاعری سے طبعی مناسبت ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''غزلیہ شاعری'' سے میں طبعی مناسبت پاتا ہوں، میں نے تجزیہ کیا تو اندازہ ہوا کہ نظم اور قصیدہ میں بھی مضمون غزلیہ باندھتے ہیں، اس سے کلام اونچا ہوجاتا ہے؛ بلکہ نعتوں میں بھی آپ کی تعبیرات غزل کا لطف دیتی ہیں۔

خواب میں حضور ﷺ کی زیارت پر نعت شریف

جب میں ''ایم،فل'' کے مقالے کے لیے حضرت کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کر رہا تھا، اس موقع سے ''نغمۂ سحر'' لے کر خدمت میں حاضر ہوا، اس کے بہت سے اشعار میری سمجھ سے بالا تھے، حضرت نے اُن سب کو سمجھایا، بعض اشعار کے سیاق وسباق، پس منظر اور شانِ ورود کو بھی واضح فرمایا، تب اچھی طرح باتیں سمجھ میں آئیں۔

''نغمۂ سحر'' میں ایک نعت شریف ہے، اس کا پہلا شعر ہی بڑا پُر کیف ہے؛ مگر عام روش سے بالکل الگ:

> کُنا ہوا تو ملی منزلِ سلام مجھے
> کمالِ بادہ کشی ہے شکستِ جام مجھے
>
> (ص۴۳)

میں نے حضرت سے اس کا مطلب پوچھا تو حضرت نے فرمایا: اس کا شانِ ورود یہ ہے کہ مجھے خواب میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، میں نے دیکھا کہ ''روضۂ اقدس کے پاس ہوں اور وہاں سے مجھے سلام کی آواز آرہی ہے۔''

میں نے اس خواب کو بھائی کاشف سے بیان کیا، انھوں نے مبارک باد دی اور مجھے کہا کہ ایک

''نعت'' کہو؛ تاکہ خواب محفوظ ہوجائے تو میں نے پہلا مصرع کہا، جس کا مطلب ہے کہ جب میں نے اپنی ساری خواہشوں کو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع کرکے، اپنے کو فنا کردیا تو مجھے یہ منزل نصیب ہوئی کہ میں روضۂ اقدس کے پاس ہوں اور مجھے وہاں سے سلام آرہا ہے۔

حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ دوسرا مصرع بھائی کاشف کا ہے، جس کا مطلب یہ ہے: مے نوشی کا کمال یہ ہے کہ میخانے کی ساری شراب پی لی جائے، جام و پیمانہ اور ساغر و مینا کو ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے توڑ دیا جائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت اور اُسوۂ حسنہ کو مکمل طور پر اپنا کر، محبتِ نبوی میں بالکل وارفتگی کی کیفیت پیدا ہوجائے یہی کمال ہے اور اتباع کا اوجِ ثریا بھی۔

خواب کو ذہن میں رکھ کر نعت کے چند اشعار پڑھیے:

عنایتوں کا یہ عالم کہ زندگی ہمہ کیف ❁ اب اور جو بھی ملے رحمتِ تمام مجھے

رحمتِ تمام سے حضور ﷺ مراد ہیں اور اس سے پہلے حرفِ ندا ''اے'' محذوف ہے۔

نمودِ صبح سعادت، نجوم در آغوش ❁ ملا ہے مہر سعادت سے یہ پیام مجھے
چلا ہوں سوئے حرم اور کہکشاں بردوش ❁ فریبِ زیست نے رکھا تھا زیرِ دام مجھے
زمانہ آنکھ سے دیکھے گا محشرِ جذبات ❁ کبھی حضور نے بخشا جو اذنِ عام مجھے
ظفرؔ نہ پوچھ، قیامت ہے وہ نظر جس نے ❁ سکھا دیا ہے تمنّا کا احترام مجھے

(ص ۴۴)

دو ایوارڈ: حضرت الاستاذ کو اپنے مجموعۂ شاعری ''نغمۂ سحر'' پر ایوارڈ بھی ملا تھا؛ مگر حضرت نے اس کو کبھی ظاہر نہیں فرمایا، جب میں ''ایم فل'' کا مقالہ لکھ رہا تھا، اس وقت میں نے پوچھنے کے لیے کچھ سوالات مرتب کیے تھے، آپ نے بس ان ہی سوالوں کے جواب دیے، ان کے علاوہ اپنی ذات سے متعلق کچھ نہ بتایا، بعد میں معلوم ہوا کہ اردو اکیڈمی لکھنؤ نے آپ کی ادبی اور شعری خدمات پر ایوارڈ بھی دیا تھا۔

اور ادیب کامل کے امتحان میں نمایاں کامیابی پر ''سرسید مڈل'' ملا، اس سے تو ہر شناسا واقف ہے۔

جب ایم فل کا مقالہ لے کر پہنچا

ناچیز نے تین شخصیات کی شاعری کے تجزیاتی مطالعے کو اپنا موضوع بنایا تھا، حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مفتی کفیل الرحمٰن صاحب نشاطؔ عثمانیؒ سابق نائب مفتی دارالعلوم دیوبند اور حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ۔ جب مقالہ جمع ہوگیا، تو حضرت کی خدمت

میں اس کی ایک کاپی لے کر پہنچا، حضرت نے جستہ جستہ دیکھا اور حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا: ''ماشاء اللہ! تمہاری زبان نکھر گئی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمات کا موقع عنایت فرمائیں!'' چند دنوں بعد ہی دارالعلوم نے ''مالا بدمنہ'' کے اردو ترجمہ کی ذمہ داری سونپی اور الحمدللہ پانچ سال سے تجوید سال دوم کے نصاب میں داخل ہے، پھر حضرت الاستاذ کی نگرانی میں ''کلیات کاشف'' کی ترتیب وتحقیق کا موقع ملا اور اس سے پہلے مولانا عبدالرحیم بستویؒ کی حیات وخدمات لکھنے کا بھی حسین موقع نصیب ہوا، حضرت الاستاذ ناچیز کے اردو ادب پڑھنے سے بہت خوش تھے، ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے مقالے میں اپنی شاعری سے متعلق کچھ نہیں پڑھا، بقیہ دونوں شخصیات سے متعلق مواد کو دیر تک دیکھتے رہے۔ اس طرزِ عمل سے میں کافی متأثر ہوا۔

خوش نویسی اور زودنویسی

حضرت الاستاذ کا رسم الخط کافی خوب صورت تھا، باضابطہ کاتب تھے، کافی دنوں تک کتابت کو بہ طور پیشہ بھی اپنایا، اللہ تعالیٰ نے زودنویسی کی دولت سے بھی نوازا تھا، بڑی رفتار کے ساتھ نہایت ہی خوب صورت تحریر لکھتے چلے جاتے، غالبًا ۱۹۹۸ء کی بات ہے، دیوبند کے ''محمود ہال'' میں جمعیۃ علمائے ہند کا فقہی اجتماع ہوا تھا، تجاویز کی تحریر آپ نے لکھی تھی، نہایت ہی رفتار کے ساتھ تھوڑی ہی دیر میں لکھ ڈالی، نہ کہیں حک وفک کیا اور نہ ہی غور وفکر، تجاویز کے نپے تلے الفاظ اور ان کے معانی کے ساتھ حضرت الاستاذ کے باریک اور خوب صورت رسم الخط میں میرے لیے بڑی کشش تھی۔ جناب مولانا محمد سلمان بجنوری مدظلہ العالی مدیر ''ماہ نامہ دارالعلوم'' کی تحریر میں حضرت الاستاذ کی تحریر کی خوشبو محسوس ہوتی ہے؛ مگر زودنویسی اور باریک نویسی کی وہ فن کاری نظر نہیں آتی جو حضرت میں تھی؛ لیکن موصوف کی تحریر راقم الحروف کو حضرت الاستاذ کی یاد دلا دیتی ہے۔

حضرت الاستاذ جب کسی کتاب کا ٹائٹل لکھواتے تب آپ کی فنی مہارت کھل کر سامنے آتی تھی، کاتب کو اپنے ذوق سے مشورہ دیتے تو آپ کی جمال پسندی کا اندازہ ہوتا، بڑے بڑے خوش نویس داد دیے بغیر نہ رہتے۔

امتحان کے پرچوں کی کتابت

ایک بار عصر بعد کی مجلس میں حضرت نے فرمایا کہ میں نے کافی دنوں تک مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے پرچوں کی کتابت کی ہے، جب کام زیادہ ہوتا تو کافی کافی دیر تک بیٹھنا پڑتا تھا، بعض اوقات اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے میں نے کتابت کی ہے۔ ان دنوں کھانا نہیں کھاتا تھا، صرف انڈے کھا لیتا تھا؛ تاکہ بار بار

استنجاء کی حاجت نہ ہو، معدے پر بوجھ نہ ہو، چستی باقی رہے اور کام کی رفتار میں فرق نہ آئے۔

فقراء کی ضد پر تحمل

حضرت الاستاذ فقراء، غرباء اور عاجزین کا بڑا خیال رکھتے تھے، ان کے در پر سائلین کا تانتا بندھا ہوتا تھا، ایک کو دے کر رخصت کرتے اور مطالعہ وتصنیف میں مصروف ہوتے کہ دوسرا آجاتا، ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دے کر واپس فرماتے، اگر کوئی اپنی کوئی ایسی مجبوری بتاتا، جس میں زیادہ پیسے خرچ ہوتے ہیں تو آپ اس کو کچھ زائد دیتے تھے۔

بہت سے فقراء کے لیے تاریخ متعین تھی، دارالعلوم دیوبند میں تنخواہ پہلی تاریخ کو مل جاتی ہے، پہلی تاریخ کو فقراء دروازے پر پہنچ کر سلام کرتے اور حضرت ہر ایک کو دیتے، متعارف فقراء کے لیے رقم متعین ہوتی تھی، وہ خاموشی سے لے کر چلے جاتے، درمیان میں نہ آتے تھے؛ لیکن بعض درمیان میں بھی آجاتے اور سلام کرتے۔

حضرت الاستاذ میں تحمل وبرداشت کی قوت باری تعالیٰ نے بہت زیادہ ودیعت کر رکھی تھی۔ فقراء کے بے جا اصرار پر کبھی بھی اُن کو ڈانٹا اور جھڑکا نہیں۔ وہ "وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ" پر کاربند تھے۔

ہدیہ قبول کرنے میں احتیاط

حضرت الاستاذ بڑے کُشادہ دست تھے، گھر والوں پر بھی اور دوست واحباب پر بھی دل کھول کر خرچ کرتے، ہدایا دیتے، اگر کوئی اہلِ تعلق ہدیہ دیتا تو اسے قبول فرمالیتے، اگر مجلس میں کوئی ہدیہ دیتا تو قبول کر کے اہلِ مجلس کو محظوظ کرتے، اگر کھانے کی چیز ہوتی تو سب کو کھلا دیتے۔

اگر کوئی ایسا آدمی ہدیہ دیتا جس سے حضرت کا زیادہ تعلق نہ ہوتا تو آپ قبول نہ فرماتے، اگر اصرار کرتا تو اس سے انقباض ہوتا تھا۔

آج کا دور مال ودولت کا ہے، مال کے لیے لوگ کیا کیا جائز اور ناجائز حیلے کرتے ہیں؛ لیکن حضرت الاستاذ اس سے کوسوں دور تھے، جیسے اُن کے دل میں دنیا کی محبت تھی ہی نہیں۔

ضیافت

ضیافت بہت ہی شوق سے کرتے، قسم قسم کے لذیذ کھانے بنواتے اور مہمانوں کو اصرار کے ساتھ کھلاتے، ضیافت میں اکثر مقروض ہوجایا کرتے؛ لیکن کسی کو احساس نہ ہونے دیتے۔ مہمانوں کی کثرت اور ضیافت کا معیار قابلِ رشک ہوتا تھا۔ حیدرآباد سے جناب رحیم الدین انصاری مدظلہٗ اور مولانا محمد فاروق صاحب مفتاحیؒ آتے تو اکثر حضرت کے گھر ہی ٹھہرتے تھے اور بھی بہت سے مہمان

اپنے لیے وہاں سہولت محسوس کرتے تھے۔

عصر بعد کی مجلس میں روزانہ دس بیس اور کبھی پچیس تیس اساتذہ طلبہ اور اہلِ تعلق حاضر ہوتے، ہر ایک کو نہایت ہی نفیس پیالی میں چائے پیش کی جاتی، پتی کافی قیمتی ہوتی تھی، یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اسفار سے کنارہ کشی

حضرت الاستاذ سفر سے وحشت محسوس کرتے تھے، بڑی مجبوری میں سفر کرتے، مثلاً جمعیۃ علمائے ہند کا اجلاس، یا اس کا فقہی اجتماع ہوتا، یا کسی اہلِ تعلق کا حد درجہ اصرار ہوتا تو ہی سفر کرتے، اپنے وطن بجنور بھی کبھی اتفاق سے ہی کسی کی شادی یا غم کے موقع سے جاتے تھے۔

طبیعت میں اپنی نفی راسخ

حضرت الاستاذ میں اپنے کمالات کی نفی راسخ تھی، اپنے کو بالکل کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے، اپنے شاگردوں کو اپنے سے بڑا سمجھتے تھے، اپنے علم کو بالکل ہی کم تصور کرتے تھے، کہتے بھی رہتے کہ بیٹے! مجھے تو کچھ نہیں آتا، پھر اس کے دلائل دینے لگتے، سامنے والا بالکل ساکت وصامت رہ جاتا۔

خوش مزاجی

حضرت الاستاذ کی ذہانت وفطانت کی طرح آپ کی خوش طبعی اور خوش مزاجی بھی کافی مشہور ومعروف ہے، آپ کی اس صفت نے بہت سے قلوب کو آپ سے قریب کردیا تھا، دن بھر کی تکان آپ کے یہاں عصر بعد کی مجلس میں دور ہوجاتی تھی۔ اگر آپ کی خوش مزاجی اور لطائف کو جمع کیا جائے تو مستقل ایک مضمون ہوجائے گا۔

(۱) حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستویؒ سے آپ زیادہ دلگی کیا کرتے تھے، ایک بار موصوف محترم پان کھائے ہوے تھے، اُن کو کُلی کرنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ جلدی سے اٹھے اور اندر سے اُگل دان لے کر آئے اور فرمایا: ''مولانا اگلدان کو شرفِ کلی بخشیں گے''۔ اس جملے سے ایک طرف تو مولانا کے منطقی اور فلسفی رجحان کا مذاق کیا، اور کلی وجزئی کی طرف رمز فرمایا، دوسرے ان کی محترم شخصیت کا اعتراف بھی فرمایا کہ ان کے کلی کرنے کی وجہ سے اُگلدان کو مکمل عزت ملے گی۔

(۲) ایک بار حضرت مولانا بستویؒ نے مغرب کی نماز پڑھائی اور بڑے ہی اطمینان وسکون سے نماز پوری ہوئی، آپ نے نماز کے بعد فرمایا: ''فجر کا مزا آگیا۔''

موت کے لیے بالکل تیار

حضرت الاستاذ کی زندگی میں ایک خاص چیز دیکھی کہ آپ موت کے لیے ہر لمحہ بالکل تیار رہتے

تھے، آٹھ سال پہلے بنگلہ دیش تشریف لے گئے، وہاں کہیں تو ہیلی کاپٹر اور کہیں مشین والے بوٹ (کشتی) پرسوار ہونے کا اتفاق ہوا، ساتھ میں ایک اور بزرگ تھے، بوٹ جو بالکل کھلا ہوا ہوتا ہے، وہ جب تیز رفتاری سے چلتا ہے تو بیٹھنے والوں کو بڑی وحشت ہوتی ہے، بعض وقت اوسان خطا کر جاتے ہیں؛ لیکن حضرت اس پر بالکل مطمئن تھے، واپسی کے بعد جب اس کا ذکر ہوا اور پوچھا گیا کہ سب لوگ اس پر گھبرائے ہوئے تھے؛ مگر آپ بالکل مطمئن تھے، کیوں؟ تو فرمایا: بھائی، موت جب آنی ہے آجائے گی، اگر وہیں موت لکھی ہوتی تو آجاتی؛ اس لیے مطمئن تھا۔

غرض یہ کہ حضرت الاستاذ موت کے لیے اپنے کو ہر وقت تیار رکھتے تھے، نہ تو کسی بندے کا حق باقی رکھتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے واجب احکام میں سے کچھ باقی رکھتے۔ یہی ایمانِ کامل اور مؤمنِ کامل کی علامت ہے، اگلی دنیا کے افضل واعلیٰ ہونے پر اُن کو بالکل اطمینان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت کے بغیر یہ صفت پیدا نہیں ہوسکتی۔

اپنی علمی اور دینی خدمات پر اطمینان

حضرت الاستاذ کے اندر یہ بات بھی محسوس ہوئی کہ آپ کو اپنی علمی، دینی اور ملی خدمات کے شرعاً صحیح اور درست ہونے کا بالکل اطمینان تھا، اپنے ان کاموں کو محض اللہ رب العزت کی رضامندی کا ذریعہ سمجھتے تھے، آپ کی ضخیم تصنیف ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' یہ اگرچہ ایک بڑے بزرگ کے موقف کی تردید میں آپ نے تصنیف فرمائی؛ مگر اس کے ہر ورق پر آپ اجر خداوندی کی پوری امید رکھتے تھے۔

بعض وقت بعض لوگوں نے آپ کی کسی خدمت پر اعتراض کیا تو آپ نے ان کو اطمینان دلایا کہ نہیں، میں نے اس کو اللہ کی رضامندی کے لیے کیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے پورے اطمینان کے ساتھ اجر کی امید رکھتا ہوں۔

ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرماتے کہ وہ ذات ہر دو عالم سے غنی اور مستغنی ہے؛ اس لیے ڈرتا بھی ہوں۔

چند نصیحتیں

(۱) ایک بار خدمت میں حاضر ہوکر بتایا کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ العالی کی نگرانی میں ''سراجی'' کی شرح لکھ رہا ہوں، تو آپ بہت خوش ہوے اور فرمایا: مفتی صاحب کی نگرانی بڑی خوش نصیبی کی بات ہے، بیٹے! خوب محنت کرو، آج لکھ کر پھاڑ دینا بھی ترقی کا زینہ ہے، بہت لکھنے کے بعد ہی لکھنا آتا ہے، پھر تواضعاً محض سمجھانے کے لیے ارشاد فرمایا: ''میں نے

بہت سی ایسی تحریریں لکھی ہیں جو میری طرف منسوب نہیں ہیں، کسی اور کے نام سے طبع ہوئی ہیں۔ آج بھی ''اہتمام دارالعلوم'' کی بہت سی تحریریں میں ہی لکھتا ہوں، اس کی برکت دیکھو کہ میں آج بخاری شریف کی شرح لکھنے کے لائق ہوگیا، ایضاح البخاری کی چار جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔''

اس وقت اتنی ہی شائع ہوئی تھیں، وفات سے پہلے پہلے تک دس جلدیں آچکی ہیں، اللہ تعالیٰ محترم دوست مولانا فہیم الدین بجنوری مدظلہ کو تکمیل کی توفیقِ ارزانی نصیب فرمائیں!

(۲) اسی مجلس میں یہ بھی فرمایا کہ تم مولانا سعید کے قریب رہتے ہو، ان کے اندر یہ خوبی ہے کہ اسٹیج پر تقریر سے پانچ منٹ پہلے بھی اگر ان کو کوئی موضوع دیا جائے تو اس انداز اور ترتیب سے بیان کرتے ہیں، جیسے پہلے سے انھوں نے اس کی خوب تیاری کر رکھی ہے۔ دوسری شخصیت مولانا انظر شاہ صاحب کی ہے، ان کے اندر بھی یہ خوبی ہے، تم بھی اپنے اندر یہ خوبی پیدا کرنے کی کوشش کرو، یہ بڑی بہترین خوبی ہے۔

(۳) ایک موقع سے فرمایا: غصہ کے وقت خاموش رہو، کچھ نہ بولو! اور یہ سوچو کہ اس وقت بولنا مناسب نہیں، بعد میں سوچ کر جواب دوں گا، اس کا بڑا فائدہ ہے، بعد میں سوچو گے تو انفعالی حالت میں بولنے کا نقصان سمجھ میں آجائے گا۔

(۴) ایک بار ارشاد فرمایا کہ اگر تمہاری بات معقول اور مدلل ہو پھر بھی اس پر کوئی اعتراض کرے تو اس کا اثر نہ لو۔

❁ ❁ ❁

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ کے
اوصافِ حمیدہ

بہ قلم: مولانا توحید عالم قاسمی بجنوری
مدرس دارالعلوم/ دیوبند

راقم درج ذیل سطور میں ایک منفرد، مثالی، مردم شناس، رجال ساز، صلاح وتقویٰ سے آراستہ، صلح وآشتی سے مزین، اکابر واسلاف کی محبّ وعاشق، خُردوں اور چھوٹوں کی محسن ومربی، علم وفکر کی آفتاب وماہتاب اور باتوفیق وباعمل شخصیت کے چند نقوش کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش اور سعی کررہا ہے؛ جبکہ راقم اپنی بے علمی، کوتاہ فہمی، بے بصیرتی اور زبان وادب سے نادانی کا کھلے لفظوں میں معترف ہے۔

حضرت الاستاذ حضرت اقدس مولانا ریاست علی صاحب بجنوری قدس سرہ استاذِ حدیث وسابق ناظمِ تعلیمات دارالعلوم دیوبند ونائب صدر جمعیۃ علماء ہند کی ذاتِ ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے اور ایسی ذات کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانے جیسا ہے؛ البتہ اُذْکُروا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ پر عمل کرتے ہوئے حضرت والا کی وہ خوبیاں، صفات وکمالات سپردِ قرطاس کیے جارہے ہیں، جن سے راقم سطور جیسے ان گنت افراد متاثر ہوتے رہے ہیں اور اوصاف وخصائل کے تذکرے سے مقصود حضرت والا قدس سرہ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کے لیے اپنی اپنی پرسنل اور نجی زندگیوں میں حضرت والا قدس سرہ کی ذات کو آئیڈیل اور نمونہ بناکر مذکورہ صفات کو اپنا کر حضرت والا قدس سرہ کو حقیقی سکون اور راحت بہم پہنچانا ہے؛ کیوں کہ یہ بھی مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا میں آئے گا۔

حضرت الاستاذ حضرت اقدس مولانا ریاست علی بجنوری قدسرہ کو ذات باری تعالیٰ نے بے شمار اور ان گنت خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا؛ لیکن راقم سطور درج ذیل سطور میں ان تمام کمالات واوصاف میں سے چیدہ چیدہ خوبیوں کو ہی رقم کررہا ہے، یہ نہ سمجھا جائے کہ راقم نے جن اوصاف کو

بیان کیا ہے، حضرت قدس سرہ صرف انھیں خوبیوں سے آراستہ تھے یا راقم صرف انھیں اوصاف سے متاثر ہوا ہے؛ بلکہ مضمون کی طوالت اور وقت کی قلت کے پیش نظر چند پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(۱) ذکاوت وذہانت: جو حضرات حضرت قدس قرہ سے واقف ہیں وہ راقم کی تصدیق وتصویب فرمائیں گے کہ حضرت والا کا سب سے مشہور ومعروف وصف اُن کی ذکاوت وذہانت ہے، مبدأ فیاض سے حضرت والا کو ایسا غضب کا ذہن ملا تھا اور آپ اس قدر ذہین وفطین تھے کہ ہم خُردوں کو تعجب ہوتا تھا، ایک مرتبہ خود راقم سطور کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: بیٹے توحید اب ظاہری اعضا کی طرح ذہن ودماغ بھی کمزور ہوگیا، راقم نے عرض کیا کہ کیوں حضرت؟ ایسا تو نہیں ہے، آپ کو اب بھی اتنی پرانی باتیں اور علمی استحضار ہے کہ ہم جوانوں کو نہیں ہے۔ فرمایا: نہیں بیٹے، پہلے جب کسی کو دور سے آتا دیکھتا تھا تو میں سمجھ جایا کرتا تھا کہ یہ کیا کہے گا میں اس کے بولنے سے پہلے جواب تیار رکھتا تھا پھر اپنے جواب پر اس کی طرف سے ہونے والے سوال کو سمجھ جایا کرتا تھا کہ پھر میرے جواب پر یہ سوال کرے گا تو اس کا بھی جواب سوچ لیا کرتا تھا؛ لیکن اب صرف اتنا تو سمجھ جاتا ہوں کہ آنے والا کیا کہے گا اس کا جواب بھی ذہن میں آجاتا ہے؛ لیکن میرے جواب پر اس کا ردعمل اور پھر اس کا جواب ذہن میں نہیں آتا۔ یہ اور اس انداز کے بے شمار دلائل ہیں حضرت والا کی ذکاوت وذہانت کے۔

(۲) اصابتِ رائے: حضرت والا قدس سرہ کے دنیائے فانی سے تشریف لیجانے کے بعد مادر علمی دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند دونوں اداروں کے وہ ذمہ داران جن کو حضرت والا کے ساتھ مجالس میں شرکت کے مواقع نصیب ہوئے ہیں تقریباً سبھی کو اس بات کا اعتراف کرتے سنا گیا کہ حضرت والا کا سب سے اہم وصف رائے کی پختگی تھی، ہر دونوں اداروں میں نہایت اہم اور نازک مواقع آئے ان موقعوں پر حضرت والا کی رائے اتنی مضبوط اور پختہ ہوتی تھی کہ شاید دوسرا کوئی آپ کی نظیر نہ ہو۔ عصر کے بعد کی مجالس میں راقم اور دیگر شرکا، بھی بارہا دیکھتے تھے کہ کسی انتظامی مسئلے میں یا سیاسی اعتبار سے جو رائے اور نظریہ حضرت والا قدس سرہ اپناتے تھے وہ نہایت پختگی کے ساتھ اپناتے تھے، مجلس میں بعض لوگ اختلاف رائے کرتے تھے؛ لیکن بعد میں حضرت والا کی رائے کی تصویب کرنا پڑتی تھی؛ کیوں کہ بعد میں وہی بات اور رائے درست ہوتی نظر آتی تھی جو حضرت والا فرماتے تھے۔

(۳) تصلب فی المذہب: حضرت والا قدس سرہ چوں کہ ائمہ اربعہ میں سے حضرت امام ابوحنیفہ قدس سرہ کے مقلد تھے اور دورِ حاضر میں مختلف نظریات کے درمیان قاسمی دیوبندی تھے، وہ صرف نسلی نہیں؛ بلکہ بڑی بصیرت کے ساتھ تھے؛ اسی لیے جب یہ کہا جاتا کہ فلاں مسئلے میں امام

ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا موقف کمزور ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف مضبوط ہے تو حضرت بے چین ہوجاتے اور نصوص کی ایسی توجیہ اور تشریح فرماتے کہ امام صاحب کے موقف کے سامنے دوسرا موقف نہایت ہلکا محسوس ہونے لگتا، حضرت والا کا سبق غور سے سننے والے طلبہ اس کی تائید وتصویب فرمائیں گے اور ایضاح البخاری میں تقریباً ہر باب میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ کسی نے نقل کیا کہ فلاں مشہور محدث حنفیت کو مرجوح اور شافعیت کو راجح قرار دیتے ہیں تو برجستہ فرمایا کہ ایسا لگتا ہے اُن کا اصولِ فقہ کمزور ہے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین صاحب نور اللہ مرقدہ کے پاس اصول الشاشی یا نور الانوار لے کر حاضر ہوا تو حضرت فخر المحدثین نور اللہ مرقدہ نے دلالت النص، عبارۃ النص اور اشارۃ النص والی بحث اس انداز سے سمجھا دی کہ پورا اصول فقہ آسان ہوگیا۔ اسی طرح دیوبندی نظریے میں بھی آپ جیسا پختہ رائے اور مضبوط راقم نے چند ہی کو دیکھا ہے۔ راقم سطور نے جب چند سال قبل ''مسلک اہل سنت والجماعت یعنی علمائے دیوبند کے عقائد ونظریات'' نامی کتاب ترتیب دی تو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے اکابر اساتذہ کرام سے مراجعت کی بہت زیادہ ضرورت پیش آئی، اس وقت حضرت والا قدس سرہ کو دیوبندیت میں جتنا پختہ اور مضبوط پایا۔ اکابر اساتذۂ کرام میں بعض ہی کو ایسا پایا۔

(۴) عدمِ مرعوبیت: حضرت والا کو راقم نے کبھی کسی سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا؛ بلکہ بڑی مضبوطی کے ساتھ پہاڑ کی طرح جم کر گفتگو فرماتے تھے، اس کی ایک مثال راقم کے سامنے یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک عرب عالم (غالباً شامی تھے) مجلس میں حاضر ہوئے وہ دیگر اکابر اساتذۂ کرام سے مل کر آئے تھے، ان سے گفتگو چل رہی تھی وہ دورانِ گفتگو کہتے انا قاسمی، انا دیوبندی، اس پر سبھی حاضرین محظوظ ہوئے اس کے بعد وہ شکایت کے انداز میں بولے آپ حضرات نے اکابر کی تصنیفات کو عربی میں منتقل نہیں کیا یہ آپ سے شکایت ہے۔ سبھی حاضرین، بڑے چھوٹے منھ لٹکا کر بیٹھ گئے؛ لیکن حضرت والا نے برجستہ فرمایا یہ کام آپ کیجیے، اردو سیکھئے اور ہماری کتابوں کو عربی میں منتقل کیجیے، اس پر وہ خاموش ہوگئے۔

(۵) احساسِ ذمہ داری: حضرت والا قدس سرہ میں ایک بہت بڑی خوبی احساس ذمہ داری والی تھی کہ اس میں آپ دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اربابِ انتظام نے جو ذمہ داری حضرت والا کے سپرد فرمادی اس کو پوری امانت ودیانت کے ساتھ انجام دیتے تھے، حتی کہ آخری سانس تک اپنے تینوں فرزندوں کو گھریلو ذمے داری سے بالکل آزاد کررکھا تھا، تمام تر گھریلو ذمے داری خود اپنے

ذمے لے رکھی تھی؛ یہاں تک کہ تمام صاحب زادگان، پوتے وغیرہ اپنے مصارف کے لیے حضرت والا ہی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ منجھلے بیٹے جو امریکہ میں ہیں، وہ بھی دیوبند آنے کے بعد اپنی ضروریات کے لیے حضرت والا سے خرچ لیتے تھے؛ جبکہ عام طور پر جب بچے شادی شدہ ہوجاتے ہیں تو سبھی اپنے آپ کو ذمے داری سے الگ تھلگ کرلیتے ہیں؛ لیکن حضرت والا کا انداز ہی نرالا تھا۔

(۶) ضیافت ومیز بانی: ضیافت اور مہمان نوازی بھی آپ کا ایسا وصف ہے جو آپ کے اندر امتیازی شان کے ساتھ موجود تھا، عام طور پر لوگ اپنی جیب دیکھ کر مہمان نوازی کا فریضہ انجام دیا کرتے ہیں؛ لیکن ہمارے حضرت والا قدس سرہ قرض لے کر ضیافت فرمایا کرتے تھے، بعض مہمانوں کو اس کا احساس کسی طرح ہوگیا تو انھوں نے اپنے متعلقین کو بھی بتایا۔ آپ قدس سرہ اپنی اکثر زندگی میں مقروض رہتے تھے، اب چند سالوں سے کچھ فراوانی ہوئی تھی؛ لیکن ضیافت میں کبھی پیچھے نہیں رہے اور عصر بعد کی مجالس میں ہی چائے کا صرفہ کوئی چھوٹا موٹا صرفہ نہیں تھا جو پھوپا جان حضرت مولانا سلطان الحق صاحب قدس سرہ ناظمِ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند سے وراثت میں ملا تھا، اس کو پوری زندگی اپنا کر چلے گئے۔

(۷) حیاو پاک دامنی: حضرت الاستاذ قدس سرہ کی ذات والاصفاف نہایت باحیا ثابت ہوئی ہے، حضرت والا کی مجلس لالہ زار اور قہقہوں سے پرضرور ہوا کرتی تھی؛ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کہ کوئی جملہ اور فقرہ بے حیائی کا زبان پر آجائے، اسی طرح حضرت والا کی مؤقر تحریر وترتیب دادہ اور بخاری شریف کی اردو شروحات میں نہایت وقیع اور بلند پایہ شرح ایضاح البخاری میں کسی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے ضمن میں کوئی بات ایسی آجائے جو مہذب لوگوں کی زبان پر نہیں آتی یا وہ شائستگی کے خلاف سمجھی جاتی ہو وہ حضرت والا کی تحریر میں آجائے یہ بالکل ناممکن تھا، ایضاح البخاری کی ترتیب میں شریک کار رفیق محترم جناب مولانا مفتی فہیم الدین صاحب زیدمجدہ استاذ دارالعلوم دیوبند خود بیان فرماتے ہیں کہ بعض مرتبہ میری عبارت میں کوئی لفظ کھلا ہوا آجاتا ہے تو حضرت والا فوراً قلم زد فرمادیتے اور فرماتے کہ ان باتوں کو پردے کے پیچھے ہی رہنے دو۔

(۸) زہد وقناعت: جیسا کہ اوپر کی سطور میں بھی آچکا ہے کہ حضرت والا قدس سرہ کی زندگی کا اکثر وبیشتر حصہ غربت وناداری اور عسرت وتنگ دستی کی حالت میں گذرا ہے؛ لیکن اس کے باوصف حضرت والا قدس سرہ نے نہایت زہد اور قناعت کے ساتھ زندگی بسر فرمائی ہے۔ آپ قدس سرہ کی طبیعت میں حرصِ مال اور طمع ولالچ کا تو مطلب ہی نہیں تھا، ایک مرتبہ خود فرمایا کہ میں کسی جگہ سفر پر تھا

ایک صاحب نے گھر پر دعوت کھلائی اور رخصتی کے وقت کچھ رقم ہدیۃً عطا فرمائی، میں نے پوچھا کہ بھائی یہ کیا ہے؟ میزبان کہنے لگے کہ یہ ہمارے یہاں کا رواج ہے کہ مہمان کو کچھ ہدیہ دیا جاتا ہے، حضرت والا گھر واپس آگئے چند سالوں کے بعد وہ صاحب دیوبند تشریف لائے تو آپ قدس سرہ نے ان کی دعوت فرمائی اور جب وہ کھانے سے فارغ ہوگئے تو آپ نے لفافے میں کچھ رقم ہدیے کے طور پر عنایت فرمائی، وہ صاحب کہنے لگے حضرت یہ کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا: یہ وہی رواج ہے جو آپ نے میرے ساتھ فرمایا تھا۔

(۹) انسانی غم خواری وہمدردی: حضرت والا کی نہایت قدیم عادت اور پرانی صفت غم خواری وہمدردی تھی، آپ عُسرت بھری زندگی گذارتے ضرور تھے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے غریب بندوں کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، اسی لیے بہت پہلے سے متعدد لوگوں کو سالانہ وظیفہ عطا کرتے تھے اور اس سے بڑھ کر کچھ لوگوں کو ماہانہ وظیفہ بھی دیا کرتے تھے، ہم اہلِ مجلس خود دیکھا کرتے تھے کہ ہر ماہ ابتدائی ایام میں لوگ آکر بیٹھ جایا کرتے تھے اور ان کو کہنے کی نوبت بھی نہ آتی تھی کہ حضرت قدس سرہ مقررہ رقم خود عطا فرماتے یا کسی عزیز بیٹے، پوتے کے ہاتھوں بھیج دیتے تھے۔ اسی طرح وہ اساتذۂ دارالعلوم جو آپ سے گھریلو حالات میں مشورہ وغیرہ کرتے تھے، ان کی ضرورت کے وقت قرض وغیرہ سے مدد فرمایا کرتے تھے۔

(۱۰) زندہ دلی وملنساری: حضرت الاستاذ قدس سرہ کی وہ عادت اور خوبی جو سبھی کو سب سے زیادہ رُلا رہی ہے وہ آپ کی زندہ دلی ہے، آپ قدس سرہ نہایت ہی مشکل حالات میں بھی مُسکرانے کا ہُنر جانتے تھے، یہی وجہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند میں کبھی بھی ماحول گرم ہوجاتا ہے اور ہر حساس شخص کے چہرے پر اس کا تاثر نمایاں نظر آتا ہے؛ لیکن حضرت والا سب سے زیادہ واقف اور مادرِ علمی کے وقار پر جان نثار؛ لیکن عام حضرات کے سامنے ایسے پیش آتے جیسے حضرت والا حالات سے بے خبر ہیں، جب بات چھڑتی تو اولاً ایسا لگتا جیسے کچھ معلوم نہیں، بعد میں پتہ چلتا کہ حضرت والا تو معاملہ کی گہرائی وگیرائی تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اسی زندہ دلی کا اثر تھا کہ آپ سب سے زیادہ ملنسار باور کیے جاتے تھے۔ اساتذۂ مدارس اور باشندگانِ دیوبند کی نظروں میں شاید ہی آپ قدس سرہ سے زیادہ کوئی ملنسار ہو۔

❁ ❁ ❁

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوریؒ:

کچھ یادیں کچھ باتیں

از: مولانا اشرف عباس قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

استاذ عالی مرتبت، مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری کی وفات کی خبر جان کاہ نے قلب وجگر کو ہلا کر رکھ دیا، آج کئی دن کے بعد جب یہ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں تو عجب بے کیفی اور اضطرابی کیفیت ہے۔

آ! عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں پکاروں ہائے دل

اور یہ تنہا میرا حال نہیں؛ بلکہ حضرت والا کی جدائی سے دارالعلوم کے طلبہ واساتذہ بالخصوص آپ کے فیض یافتہ اساتذہ میں اب تک صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے، شاید ہی کسی اور حادثے پر قلب اتنا مضطرب ہوا ہو اور آنکھوں نے اتنے آنسو بہائے ہوں۔

آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے
شمع روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

گزشتہ چار سالوں سے کبھی کبھار کے ناغے کے استثنا کے ساتھ مسلسل آپ کے فیض صحبت اور خاص شفقت وعنایت سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہا؛ لیکن میری محرومی رہی کہ اس حادثۂ فاجعہ کے وقت میں دیوبند سے دور اپنے وطن دربھنگہ میں تھا اور تجہیز وتکفین میں شرکت کی حسرت بھی دل ہی میں رہ گئی، اگرچہ صرف ایک روز قبل حضرت والا نے فون کرکے خیریت دریافت کی اور ایک علمی کام کے سلسلے میں شدید تقاضا فرمایا اور میری طرف سے تکمیل کی یقین دہانی پر دعاؤں سے نوازتے ہوئے فون رکھ دیا؛ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ سلام، سلامِ وداع ورخصت بھی ہے۔

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

بے مثال شخصیت

حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ مردم گر اور عہد ساز شخص تھے، دارالعلوم دیوبند کے مسلک ومشرب، اس کی پاکیزہ روایات کے امین اور سلف کے بہترین جانشین تھے، علم وتقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود طبیعت کی سادگی، کمالِ تواضع، خردنوازی اور جذبۂ شفقت نے آپ کو غیر معمولی ہر دل عزیزی اور محبوبیت ومرجعیت عطا کردی تھی۔ آپ نسلوں کے مربی ومعلم رہے، دارالعلوم کی محبت آپ کے رگ وریشے میں پیوست تھی، اس کی خیرخواہی اور بقاء واستحکام کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں وقف کر رکھی تھیں، اس طرح آپ کی وفات دارالعلوم کی زریں روایات کی انتہا اور ایک عہد کا خاتمہ ہے۔

ذاتی تعلق

۱۹۹۹ء میں دارالعلوم دورۂ حدیث شریف کے لیے حاضری ہوئی تو حدیث شریف کی مشہور کتاب سنن ابن ماجہ کی تدریس آپ سے متعلق تھی، اس طرح پہلی بار بلاواسطہ آپ سے کسبِ فیض کی سعادت حاصل ہوئی، صاف اور شستہ زبان استعمال کرتے، سوالات کے جوابات اس خوش اسلوبی کے ساتھ دیتے کہ طلبہ آپ کی حاضر جوابی اور غزارت علم سے خوب مستفید ہوتے؛ لیکن اس کے ساتھ ہی نہایت صاف گوئی سے کام لیتے اور ادعاءِ علم جیسے امراض سے کوسوں دور تھے، دورۂ حدیث کے بعد ادب کے سال ''البلاغۃ الواضحہ'' پڑھنے کا موقع ملا تو ہمارے لیے علمی عملی کمالات کے مزید دریچے کھلتے اور تفہیم وتدریس کے نئے اسالیب سامنے آتے گئے، طلبہ کے ساتھ برتاؤ نہایت مشفقانہ تھا، آپ کی طرف سے درسگاہ کے تمام طلبہ کے لیے آم اور دودھ کی پرتکلف ضیافت اب تک یاد ہے۔

۲۰۰۱ء میں افتاء کی تکمیل کے بعد میں تدریس کے لیے جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ منتقل ہوگیا اور دس گیارہ سال وہاں مقیم رہا اس دوران ایک دوبار ہی خدمت میں حاضری ہوسکی۔

۲۰۱۳ء میں جب فضل ایزدی سے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لیے انتخاب ہوا تو میں نے حاضرِ خدمت ہوکر حضرت والا کو اطلاع دی تو حضرت بے انتہا مسرور ہوئے اور دعاؤں سے نوازا اور دوسرے دن جب عصر بعد کی مجلس میں حاضر ہوا تو حضرت نے وہاں موجود اساتذۂ دارالعلوم سے خود ہی وقیع الفاظ میں تعارف کرواکر مجھ جیسے دہقاں کی کلاہ کو آفتاب تک پہنچا دیا۔ اس دوران

حضرت مولاناؒ - کشاف اصطلاحات الفنون - کی تصحیح ومراجعت کا کام جناب مولانا عارف جمیل کی معاونت سے انجام دے رہے تھے، بنیادی کام ہوچکا تھا، نظرثانی کا کام چل رہا تھا کہ مولانا عارف جمیل صاحب پر شوریٰ کی جانب سے مجلّہ ''الداعی'' کی مساعدتِ تحریر کی اضافی ذمہ داری ڈال دی گئی جس کی بنا پر کشاف کے لیے وقت نکالنا دشوار ہوگیا اور ان کی جگہ حضرت نے مشورہ کرکے مجھے اس کام میں شامل فرمالیا۔ میں اسے فضلِ خداوندی اور توفیقِ ایزدی خیال کرتا ہوں کہ اس طرح مجھے اس عبقری شخصیت سے قریب رہنے اور ان کے تجربات وفیوضِ علمیہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا، روزانہ چھٹے گھنٹے میں حضرت کی رہائش گاہ پر حاضری ہوتی، میں کشاف کے کمپوز شدہ صفحات پڑھتا اور حضرت کیسنجر کے قلمی نسخے سے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے آپ نے حاصل کررکھا تھا، ضروری تصحیح فرماتے اس کام کو اس قدر انہماک اور دلچسپی سے انجام دیتے کہ اس دوران کسی کا آجانا آپ کو گراں گزرتا تھا۔ اس طرح تصحیح کا یہ مرحلہ بھی بحمداللہ پورا ہوگیا۔

تصحیح کے اس کام میں ہلکی پھلکی معاونت کی وجہ سے حضرت کی خاص عنایت وشفقت حاصل رہی، کئی موقعوں پر خاص مہمانوں کے ساتھ اپنے دسترخوان پر مجھ ناچیز کو بھی مدعو فرمایا، مجھے اگر کہیں جانا ہوتا تو دارالعلوم سے اجازت لینے کے ساتھ حضرت کو بھی اطلاع کرنی ہوتی ورنہ فوراً حضرت کا فون آجاتا، حضرت زیادہ جلسے جلوس اور تقریری پروگراموں کے قائل نہیں تھے؛ اس لیے اس نسبت سے غیرحاضری کی اطلاع بہت محتاط انداز میں دیا کرتا تھا، حضرت میرے شفیق باپ کی طرح تھے اور وہ اپنی عظمتوں کے باوجود میرے نجی معاملات اور ذاتی امور میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔

اوصاف واخلاق

حضرت مولانا کی طبیعت میں استغناء وبے نیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی حتی الوسع اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے، علالت اور پیرانہ سالی کے باوجود کسی طالب علم سے آپ نے جسمانی خدمت نہیں لی۔ ظاہری شان وشوکت کے مظاہر بھی پسند نہیں تھے، اگر کوئی آگے بڑھ کر آپ کے جوتے اٹھالیتا تو اسے فوراً آپ کی خفگی کا سامنا کرنا پڑتا، کوئی اگر مبالغہ آمیز گفتگو کرتا تو خاص انداز میں فرماتے اس میں سے کچھ فیصد کم کرلو، دارالعلوم میں عام حالات میں آپ نے صرف وہ عہدے قبول کیے جن کا تعلق تعلیم وتربیت سے بھی تھا، ورنہ عموماً عہدوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے، ایک موقع پر جب مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے جو آپ پر بہت اعتماد فرماتے اور آپ کو بھی ان سے تعلقِ خاطر تھا، نیابتِ اہتمام کا عہدہ قبول کرنے کے لیے کئی بار اصرار کیا؛ بلکہ ایک بار

شوریٰ نے تجویز بھی پاس کردی؛ مگر آپ نے صاف کہہ دیا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں دارالعلوم سے ہی مستعفی ہوجاؤں؟ حضرت کا یہ رنگ دیکھ کر مہتمم صاحب نے دوبارہ اس طرح پیش کش نہیں کی، عموماً طلبہ اور عام لوگوں کی طرف سے ہدایا قبول کرنے میں بڑا تأمل فرماتے، حتی الامکان اسفار سے گریز کرتے، حتی کہ بیرون ملک کے اسفار سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ایک مرتبہ چند خاص اہلِ تعلق نے باصرار برطانیہ آنے کی دعوت دی اور سارے انتظامات مکمل کرلیے، آپ مقررہ تاریخ پر دہلی ایئرپورٹ پہنچ گئے، ایمیگریشن کا مرحلہ آیا تو وہاں تعینات افسر نے آپ سے معمول کا سوال کیا، برطانیہ کیوں جارہے ہیں؟ آپ نے نہایت سادگی اور کمالِ بے نیازی سے جواب دیا میں تو جانا ہی نہیں چاہتا دوستوں کے اصرار کی وجہ سے مجبور ہوں، آپ کوئی ایسا نشان لگادیجیے کہ مجھے بھی ایک عذر ہاتھ لگ جائے اور میں جانے سے بچ جاؤں، آپ کے اس جواب پر افسر دنگ رہ گیا اور چہرہ بغور دیکھنے کے بعد کہا، نہیں مولانا! میں آپ کو واپس نہیں کروں گا، آپ کو برطانیہ ضرور جانا ہے۔

آپ بڑے مہمان نواز تھے، دسترخوان بڑا وسیع تھا، طبیعت میں احتیاط غالب تھی، حقوق العباد کی ادائیگی کا بڑا اہتمام فرماتے اور بسا اوقات اپنا بڑے سے بڑا حق محض اللہ کے لیے چھوڑ دیا کرتے تھے، آبائی وطن حبیب والہ کی زمین کے ایک بڑے حصہ پر بعض لوگ ناجائز قبضہ کرکے بس گئے ہیں، ایک بار ایک بڑے وکیل صاحب نے آکر پیش کش کی کہ آپ مجھ سے پچاس لاکھ روپے لے لیں اور اس کا اختیار مجھے سونپ دیں ان کو بے دخل کرکے قبضہ کرنا میری ذمہ داری ہے، آپ نے یہ خطیر رقم قبول کرنے سے صاف منع کردیا اور وہاں موجود اپنے فرزندانِ گرامی سے فرمایا: اس فکر میں مت پڑو اور آخرت کے لیے رہنے دو۔

دارالعلوم کے طلبہ واساتذہ اور کارکنان میں آپ کو غیر معمولی عظمت حاصل تھی، آپ بھی تعلقات کو خوب نبھاتے تھے، جائز سفارش سے انکار نہیں کرتے تھے، متعلقین کے دکھ درد میں شریک ہوتے، بیماری کی اطلاع پاکر خود فون کرتے اور خیریت دریافت فرماتے تھے، کبار اساتذہ دارالعلوم اور حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم آپ کا بڑا لحاظ واکرام فرماتے اور اہم امور میں آپ سے مشورہ لیتے تھے۔

آپ کو اولاد واحفاد کا بھی بڑا خیال تھا، سال گزشتہ جب فرزند گرامی مولانا سعدان جامی علیل ہوئے اور آپریشن ناکام ہونے کی وجہ سے ان کی تکلیف بڑھی تو آپ کے اضطراب اور بے چینی میں بھی کافی اضافہ ہوگیا، اگرچہ اپنے آپ کو پرسکون ظاہر کرتے، پوتے مفتی عبداللہ حمدان کے بعد آپ کو

دوسرے پوتے عزیزم شیبان سلّمہٗ کی بڑی فکر تھی، عزیزم کی تعلیم کے سلسلہ میں دسیوں بار متعلقہ اساتذہ سے ملاقات کی یا فون پر بات چیت کی۔

مجلس سونی ہوگئی

عصر کے بعد کی آپ کی مجلس ہمیشہ یاد رہے گی، مؤقر اساتذہ کا جمگھٹا ہوتا، علم ومعرفت کی باتیں ہوتیں اور لطائف وظرائف کی خوش گپیاں بھی، ملکی حالات زیر بحث آتے اور دارالعلوم کے احوال وکوائف بھی، اس بزم مئے سے ہر رند کو بادہ کشی کی اجازت تھی، مجلس کو آپ گلِ گلزار بنانا بھی جانتے تھے اور اگر نامناسب رخ پر جانے لگے تو اس کو سنبھالنا بھی، آپ ہی میرِ مجلس ہوتے شرکاء مجلس کی چائے سے ضیافت فرماتے، کوئی تھوڑی دیر کے لیے آتا تو تازہ دم ہوکر واپس جاتا؛ لیکن آہ اب وہ مجلس سونی ہوگئی، علمِ بصیرت کی بساط الٹ گئی، وہ کیا گئے قیامت ڈھا گئے، اب روحانی ملاقات صرف مزارِ قاسمی میں ہوسکے گی، اب وہ ہماری مجلس سے اٹھ کر اس جہاں کو آباد کرچکے، جہاں ہمارے گرم گرم آنسو بھی انھیں واپس نہیں لاسکتے اور وہ وہاں کے اعزاز واکرام اور لامتناہی انعامات کو چھوڑ کر واپس بھی کیوں آنا چاہیں گے۔

محفل سے اٹھ کے رونقِ محفل کہاں گئی
کھل اے زبانِ شمع کہ ماجرا کھلے

خدائے رحمٰن سدا آپ کو اپنی بے پایاں رحمتوں کی آغوش میں رکھیں۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❁ ❁ ❁

حضرت ظفؔر بجنوریؒ کا
حضرت کاشفؔ الہاشمیؒ سے کسبِ فیض

از: مولانا خورشید حسن قاسمی
دارالعلوم دیوبند

تاریخ، ادب، صحافت، انشاء پردازی، مقالہ نویسی اورمضمون نگاری کے حوالہ سے مولانا ریاست علی ظفؔر صاحب بجنوریؒ کی گرامی قدر شخصیت دراصل حضرتؒ کے خصوصی مربی ومشفق استاذ جناب مولانا کاشف الہاشمی راجوپوریؒ کی مرہون منت ہے۔

مولانا کاشف الہاشمی صاحبؒ دیوبند کے قریب واقع خاندانِ سادات وشیوخ کی قدیم بستی راجوپور کے باشندہ تھےاورجن کا شمارعلمائے دین نامور دانشورانِ دیوبند میں ہوتا ہےاورجنھوں نے تقریباً نصف صدی قبل رواں دواں سلیس اردو میں سب سے پہلے لغات اورفرہنگ کے اعتبار سے آسان تفسیر قرآن کریم ''تفسیر ہدایت القرآن'' کا آغاز فرمایا جواردوتفاسیر میں ایک یادگار شاہکار کی حیثیت سے متعارف ہے، اس کے علاوہ اردو میں ''تفسیر طنطاوی'' و''تفسیر مظہری'' کے ابتدائی حصے کا ترجمہ فرمایا جوعرصہ سے بازار میں نایاب ہے، البتہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں اس کے نسخے موجود ہیں۔مولانا بجنوریؒ کا خصوصی تعلق زمانۂ طالب علمی میں خاص طور سے مولانا کاشف الہاشمیؒ سے رہا۔

آخرالذکر مولانا موصوفؒ راقم الحروف کے تاریخی آبائی مکان ''نبیہ منزل'' میں طویل عرصہ قیام پذیر رہے، ''نبیہ منزل'' یہ دیوبند کا وہی تاریخی قدیم مکان ہے، جوایک دانش گاہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں دورِ طالب علمی میں منتسب شیخ الہندؒ مولانا نبیہ حسن صاحبؒ سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کے تلامذہ کی حیثیت سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند جیسی برگزیدہ شخصیات کی آمدورفت رہتی تھی، تقسیمِ ہند کے موقع پر دانشورانِ دیوبند کا یہی مکان ''دارالمشورہ''

بھی رہا۔ مذکورہ تاریخی ''دانش گاہ'' اور راقم الحروف کے جدّی مکان میں دارالعلوم کے جیدالاستعداد طلبا، کا ہمہ وقت اجتماع رہتا تھا، جو کہ حضرت مولانا کاشف الہاشمی صاحبؒ سے خوب خوب کسب فیض فرماتے، ان طلبا، میں حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ، مولانا عبدالجلیل راغبی آسامی، مولانا ابوالحسن صاحبؒ بارہ بنکوی، مفتی فضیل الرحمٰن ہلالؔ عثمانی وعالی جناب مولانا حسیب صدیقی وبرادرِمکرم حضرت مولانا شاہد حسن صاحب قاسمیؒ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند جیسے ممتاز فضلائے دارالعلوم تھے۔

آبائی مکان ہونے کی وجہ سے بچپن میں راقم الحروف کی مذکورہ مکان میں ہروقت حاضری رہتی اور مذکورہ حضرات سے خانگی نوعیت کا رابطہ رہتا اور ان حضرات کے والد ماجد حضرت مولانا سیّد حسن صاحبؒ سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کے مخصوص تلامذہ ہونے کی وجہ سے مذکورہ حضرات کی والدصاحبؒ کی خدمت میں بکثرت حاضری رہتی اور زیادہ تر مولانا ریاست علی صاحبؒ کا خارجی وقت احقر کے اسی جدّی مکان میں گزرتا، اس کے علاوہ حضرتؒ کے برادرِنسبتی جناب مولانا برہان الحق صاحب قاسمی بجنوری استاذ شعبۂ فارسی دارالعلوم دیوبند کی راقم الحروف کے ساتھ تقریباً پانچ سال تک شعبۂ فارسی میں رفاقت رہی اور جماعتِ فارسی کی اہم کتب میں ساتھ رہا، اس وجہ سے بھی راقم کی حضرتؒ کے سسرالی مکان میں مستقل آمدورفت رہتی جس کی وجہ سے حضرتؒ سے احقر کا تعلق گھر جیسا رہا؛ چنانچہ اسی مشفقانہ تعلق کا مولانا اکثر اظہار بھی فرماتے، ماضی میں راقم الحروف کو خانگی مسائل میں مختلف النوع دشوارکن مراحل کا سامنا ہوا اور مختلف حوادث سے گزرنا ہوا، جن کی تفصیل کا اس جگہ موقع نہیں۔

بہرحال ذاتی وخانگی نوعیت کے پیچیدہ مسائل میں مولاناؒ کی احقر کے ساتھ پوری معاونت رہی اور حضرتؒ نے ہرموقع پر راقم الحروف کی سرپرستی فرمائی، آج حضرتؒ کی شفقتیں رہ رہ کر یاد آرہی ہیں، حضرت مولاناؒ درحقیقت اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، ایک تاریخ اور ایک تحریک تھے، حضرتؒ کی وفات حسرت آیات سے آج اہل خانہ کے علاوہ تمام ہی علمی حلقے آہ بلب اور اشکبار ہیں، نصف صدی سے زائد مولانا کی تدریسی، تصنیفی، ادبی، صحافتی وسماجی خدمات کا تقاضہ ہے کہ حضرتؒ کی شخصیت پر سمینار منعقد کیے جائیں اور حضرتؒ کے سانحہ وفات کی وجہ سے جو علمی خدمات درمیان میں رہ گئی ہیں اُن کی تکمیل کا انتظام قائم کیا جائے اور یہ کام حضرتؒ کے صاحبزادگان کے ذریعے زیادہ آسان ہیں اور احقر کی ذاتی رائے میں اس یادگاروتاریخی اقدام کے لیے حضرتؒ کے صاحبزدگان وحضرتؒ کے علوم کے حقیقی امین اور ترجمان عزیزم مفتی محمد سعدان قاسمی سلّمہٗ سے بظاہر زیادہ توقع کی جاسکتی ہے۔
خداوندقدوس حضرتؒ کی مغفرت فرمائیں اور اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے، آمین!

ایک مردِ دانا کی رحلت

از: مفتی اشتیاق احمد قاسمی
استاذ حدیث جامعہ نورالعلوم، بہرائچ

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر تو ویرانے پہ کیا گذری

مدارس اسلامیہ کی چہل پہل اپنی سالانہ میعاد پر پہنچ کر ختم چکی تھی، قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں ایک محدود وقت کے لیے ٹھہر چکی تھیں، طالبان علوم کے قافلے اپنا سالانہ سفر پورا کر کے مدارس سے اپنے وطن مالوف اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکے تھے، خیر وبرکت والے مہینہ کی آمد آمد تھی، ایسے میں ام المدارس ازہرالہند دارالعلوم دیوبند کا ایک قابلِ فخر سپوت، مایہ ناز فرزند، جلیل القدر محدث، صاحب طرز ادیب عالم فانی سے منھ موڑ کر اس عالم جاودانی کی طرف روانہ ہوگیا جہاں سے کسی کی واپسی ممکن نہیں۔

۲۳ر شعبان ۱۴۳۸ھ کی صبح یہ اندوہناک خبر بڑی حسرت ویاس کے ساتھ سنی گئی کہ دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز استاذ اور بے نظیر ترانہ دارالعلوم دیوبند کے تخلیق کار حضرت مولانا ریاست علی بجنوری اپنے ربِ حقیقی سے جاملے (انا للہ وانا الیہ راجعون) اس خبر نے علمی دنیا کو اور بالخصوص قاسمی برادری کو سخت افسردہ اور سوگوار کیا، موصوف ایک بلند پایہ عالم، صاحب طرز ادیب، فکرار جمند اور ذہن اخّاذ کے مالک انسان تھے، خالق کائنات کی طرف سے ان کو قلب سلیم اور دل دردمند سے وافر حصہ عطا کیا گیا تھا، وہ نہایت صائب الرائے، انتہائی منکسر المزاج، ہر دلعزیز اور باوقار شخصیت کے مالک تھے، زندگی کا بیشتر حصہ دارالعلوم اور دیوبند کی علمی وروحانی فضاؤں میں گذرا تھا، جو آدم گری اور مردم سازی کا روئے زمین پر ایک نایاب کارخانہ ہے، جہاں سے علم وفن کے ہیرے وموتی ماہرِ فن رجالِ کار، دعوت وارشاد اور تزکیۂ قلوب کے شیوخ اور مزکی پیدا ہوئے اور جس سرزمین کو عالم اسلام کی نابغۂ روزگار شخصیتوں اور عبقری ذوات قدسیہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل رہا ایسے علم پرور شخصیت ساز اور کثافتوں سے پاک اور پاکیزہ ماحول میں جب ایک مبدأ فیاض کی بارگاہ سے عقل ودانش کا وافر

حصہ وصول کرنے والے کی علمی پرداخت ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ علم وعمل کی کن بلندیوں پر فائز ہوگا اور اس کا ستارۂ اقبال کتنا بلند ہوگا؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، دارالعلوم دیوبند ہی میں آپ کی پوری تعلیم ہوئی ۱۳۷۸ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند سے امتیازی نمبرات سے کامیابی ملی اس کے بعد اپنے استاذ فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدینؒ صاحب کے درس بخاری میں بالالتزام دوبارہ شرکت فرماکر درس کو تحریراً ضبط کیا، جب کہ پہلے سال میں بھی استاذ محترم کے مکمل درس بخاری کو ضبط فرماچکے تھے، پھر بعد میں تہذیب وتبویب اور تحقیق وتفصیل کرکے ایضاح البخاری کے نام سے اس کی اشاعت شروع کی، جو اپنے بسط وجامعیت کے سبب بہت سی شروح بخاری پر بھاری ہے؛ بلکہ بعض اہل علم کی زبان میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عالمی شہرت یافتہ کتاب فتح الباری شرح بخاری کو اردو قالب میں ڈھال دیا گیا ہو اور اس میں علماء دیوبند کے افادات کا اضافہ کردیا گیا ہو، الحمدللہ اس کی دس جلدیں منظر عام پر آکر علماء اور اہل علم کے طبقہ میں کافی مقبولیت وداد وتحسین حاصل کرچکی ہیں اور جس کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، اللہ اپنے فضل سے اس کی تکمیل کی راہ آسان فرمائے (آمین)، ۱۹۷۲ء میں آپ کا دارالعلوم دیوبند میں عربی مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا، اپنی خداداد صلاحیت، انداز تدریس وتفہیم اور فہم وفراست سے اساتذۂ دارالعلوم میں ایک امتیازی شان پیدا کی، پھر جب ۱۴۰۲ھ میں دارالعلوم میں انقلاب آیا اور دارالعلوم ایک سخت آزمائش کے دور سے گذرا تو منصبِ تعلیمات کی عظیم ذمہ داری سپرد کی گئی، آپ نے اپنی زیرکی وعقل مندی سے نظام تعلیم کو فعال اور نہایت مضبوط ومستحکم کیا، امتحانات کے نظام کو نئے انداز سے درست کیا جس کے نتیجے میں تعلیمی وتربیتی ہر اعتبار سے دارالعلوم کو مرکزیت کا مقام حاصل ہوا اور ایک بار پھر اس کی علمی بہاریں لوٹ آئیں اور دارالعلوم نے قدیم طریقہ پر اپنی کوکھ سے آفتاب و ماہتاب کے روشن ستارے نکالنا شروع کردیا، دارالعلوم اپنے آزمائش کے دور میں مختلف حالات سے نبرد آزما رہا؛ لیکن ان تمام میں یہ مردآہن، میدان میں ڈٹا رہا اور دارالعلوم اور اس کے کاز کو ادنیٰ نقصان پہنچانا گوارا نہ کیا، دارالعلوم پر کوئی نازک حالت پیش آتی یا دارالعلوم کی طرف سے کوئی محفل سجائی جاتی تو دارالعلوم کی ترجمانی کے لیے اور اس کے موقف کو رکھنے کے لیے جس موقر ذات کا انتخاب ہوتا وہ بالعموم حضرت مولانا کی ذات ہوتی، جو دارالعلوم کی اقدار وروایات کی پاسداری کرتے ہوئے، اس کی نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی متوازن گفتگو فرماتے جو دارالعلوم کی ترجمانی کے ساتھ زبان وادب کا شاہکار ہوتی اور ہر ایک سامع سر دھننے پر مجبور ہوجاتا، ویسے مولانا کا اصل میدان درس وتدریس کا تھا اور وہ اس میدان کے بڑے شناور اور سرخیل لوگوں میں سے تھے، تقریر وخطابت کے لیے اسفار کم ہوتے تھے جب کسی کا زبردست اصرار ہوتا اسی وقت

سفر فرماتے تھے؛ لیکن جہاں جاتے وہاں وہ اپنی علیحدہ شناخت چھوڑ کر آتے، دارالعلوم کی طرف سے منصب تعلیمات کی سپردگی کے ابتدائی دور میں آپ کا سرائے میر اعظم گڈھ کے قدیم ومعروف ادارہ بیت العلوم کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانا ہوا، وہاں آپ کا ردّ مودودیت پر ایک فاضلانہ اور محققانہ خطاب ہوا، اجلاس میں معروف عالم دین اور خطیب شہیر مولانا ضمیر احمد صاحبؒ جلال پوری بھی موجود تھے، جو خود ایک بڑے خطیب تھے، مولانا کی تقریر سے کافی متاثر ہوئے اور لوگوں کے سامنے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں نے دارالعلوم کی طرف سے یہ فیصلہ سنا کہ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری کو نظامت تعلیمات کا منصب سپرد کیا گیا ہے، تو اس فیصلہ پر بڑا تعجب ہوا کہ یہ دارالعلوم کا بڑا عظیم منصب ہے، اس پر تو بڑے فائق لوگ فائز ہوتے رہے ہیں، یہ منصب ان کو کیسے دے دیا گیا؛ لیکن آج ان کے بیان وخطاب سے شرح صدر ہوگیا کہ ''حق بہ حقدار رسید'' کے وہ مصداق ہیں، مدارس کی چہاردیواری میں علمی شغل وانہماک رکھنے والوں کے ساتھ بالعموم یہ صورت پیش آتی ہے کہ خلق خدا ان کے علمی مرتبہ وتفوق سے نابلد ہوتی ہے، مولانا کو تمام عربی علوم وفنون پر کامل دسترس کے ساتھ اردو ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق ملا تھا، وہ ایک اچھے ادیب ہونے کے ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے، شعروشاعری کو انھوں نے اپنا پیشہ نہیں بنایا تھا؛ لیکن طبیعت کی موزونیت اور عشقِ رسول کی آگ جب سینہ میں شعلہ زن ہوتی تو وہ نظم کا قالب اختیار کرلیتی جو بے پناہ معنویت اور عشق وجذب کی کیفیت لیے ہوتی، اس سلسلہ میں آپ کے کلام کا ایک مجموعہ ''نغمۂ سحر'' کے نام کے ساتھ شائع ہو چکا ہے، جو فنِ شاعری اور علم وادب کا بہترین مرقع ہے اور بالخصوص چند ترانے، ترانۂ دارالعلوم، ترانۂ جمعیۃ، ترانۂ معہدالبنات اپنے صنف ونوع میں طاق وبے نظیر ہیں، خاص طور پر ترانۂ دارالعلوم جس کی نظیر بظاہر ممکن نہیں، جس کے ایک ایک لفظ میں اور ایک ایک سطر میں تاریخ کے تابندہ نقوش اور تاریخ کے حسین شہ پاروں کو موتی کی لڑی میں پرویا گیا ہے، جس میں تخیل کی رفعت، لفظوں کی شوکت، تشبیہ کی ندرت، بیان کی لطافت، زبان کی شستگی، بندش کی چستی، اشعار کے سانچوں میں ڈھل کر آگئی ہیں، بڑے سے بڑا ماہر فن اس کو دیکھ کر اور سن کر یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس سے بہتر ممکن نہیں، یہ دارالعلوم اور اس کے عظیم ترین اکابرین کے عشق میں ڈوب کر کہے گئے اشعار ہیں جس میں دارالعلوم کے مؤسسین واکابرین کی شوکت وعظمت اور ان کے شاندار کارناموں کی روشن تاریخ کی بہترین نقاب کشائی کی گئی ہے۔ مولانا گوناگوں صفات کے حامل انسان تھے، تواضع وانکساری، ہمدردی وغم گساری اور جادۂ حق پر استقامت میں وہ حددرجہ ممتاز تھے، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے کرم اور رحمتوں کی بارش فرمائے۔

عصرِ حاضر کی جامع کمالات شخصیت

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ

از: مولانا مفتی ریاست علی قاسمی رام پوری
استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ

موت وحیات اس کائنات کی فطرت میں داخل ہے، ذات باری کے علاوہ ہر شے فانی اور اس کا وجود عارضی ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض انسانوں کا وجود مخلوق خداوندی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان اور ضرر پہنچاتا ہے اور ان کے جانے سے کسی کو افسوس اور حزن وملال نہیں ہوتا ہے؛ لیکن انسانوں میں بعض اشخاص وافراد بے شمار مخلوق خداوندی کو نفع اور فائدہ پہنچانے والے ہوتے ہیں اور خلقِ کثیر کی نفع رسانی کا وہ سبب اور ذریعہ ہوتے ہیں، فیض رسانی کے مختلف اور متعدد ذرائع اور ابواب ان سے متعلق ہوجاتے ہیں۔ ایسے افراد کے دنیا سے رخصت ہوجانے پر بے شمار انسانوں کو افسوس اور غم ہوتا ہے؛ کیونکہ خیر کے متعدد ابواب ایسی شخصیات کے رحلت ہوجانے سے مسدود ہوجاتے ہیں اور خلقِ کثیر کی نفع رسانی اور فیض رسانی کا سلسلہ بند ہوجاتا ہے۔

ایسی ہی صاحب عظمت اور بافیض شخصیات میں ہمارے مؤقر محترم، مشفق استاذ، پدر روحانی، بے شمار اوصاف اور کمالات سے متصف، دارالعلوم دیوبند کے عظیم محدث، صاحبِ طرز ادیب حضرت اقدس مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ کی ذات گرامی بھی ہے جو گذشتہ روز بے شمار متعلقین، اعزہ، اقربا، تلامذہ، فرزندان دارالعلوم دیوبند اور محبانِ دارالعلوم دیوبند کو روتا، بلکتا چھوڑ کر چلے گئے۔ إنَّا للّٰہِ وإنا إلیہ راجعون، إن لِلّٰہِ مَا أَعْطٰی وَلَہٗ مَا أَخَذَ وَکُلُّ شَيْءٍ عِنْدَہٗ بِأَجَلٍ مُسَمًّی.

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گل کی نگہبانی کرے

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

آپ ۱۹۵۱ء کے اواخر میں اپنے پھوپا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب فاروقی قدس سرہٗ

کے ہمراہ دیوبند تشریف لائے اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر فارسی اور ابتدائی عربی سے لے کر دورۂ حدیث تک تعلیم حاصل کی اور تمام ہی کتبِ درسیہ از اوّل تا آخر اساتذۂ دارالعلوم سے پڑھیں۔ ۱۹۵۸ء میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت پائی۔

ایضاح البخاری کی ترتیب واشاعت

فراغت کے بعد تقریباً تیرہ سال تک اپنے مربی ومشفق استاذ فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تربیت میں رہے اور اپنے استاذ کے درسِ بخاری میں شرکت فرما کر آپ کی تقاریر درس بخاری کو قلم بند فرماتے رہے اور متعدد سالوں کے دروس بخاری کی تقاریر علیحدہ علیحدہ محفوظ رکھتے رہے، پھر اپنے استاذ گرامی کی اجازت ومشورہ سے اس کو مرتب کر کے شائقین علوم حدیث کے استفادہ کے لیے شائع کرنے کا سلسلہ شروع فرمادیا، جس کا طریقہ کار یہ تھا کہ تمام سالوں کی تقاریر کو سامنے رکھ کر نیز شروح بخاری اور متعلقہ کتب کا مطالعہ فرما کر ایک مقالہ مرتب کیا جاتا تھا پھر حضرت مولانا لقمان الحق صاحب فاروقی بجنوریؒ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند اس کی مراجعت فرماتے تھے پھر حضرت فخر المحدثینؒ پوری تقریر ازخود سماعت فرماتے اور اس کی اصلاح کراتے یا بعض دفعہ مسودہ اپنے پاس رکھ لیتے اور اپنے قلم سے اصلاح کرتے تھے۔ حضرت فخر المحدثین نور اللہ مرقدہٗ کی حیاتِ طیبہ میں تقریباً تیرہ سو صفحات کا مسودہ نظر ثانی اور تصحیح اور حضرت کی اصلاح کے بعد منصۂ شہود پر جلوہ نما ہوا اور شائقین علوم نبوت اس سے استفادہ کرنے لگے؛ لیکن حضرتؒ کی حیاتِ طیبہ میں اس بابرکت کام کی تکمیل نہ ہوسکی اور حضرت فخر المحدثین نور اللہ مرقدہٗ چند ماہ کی علالت کے بعد ۲۰/صفر ۱۳۹۲ھ مطابق ۵/اپریل ۱۹۷۲ء کو دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث، منصب صدارت تدریس کو چھوڑ کر اپنے مولائے حقیقی سے جاملے اور حضرت کے وصال کے بعد بھی حضرت مولانا لقمان الحق صاحب فاروقی نور اللہ مرقدہٗ کی معاونت اور اشتراک سے ''ایضاح البخاری'' کی ترتیب وتسوید کا مبارک سلسلہ چلتا رہا اور قسط وار اس کی اشاعت بھی ہوتی رہی۔ پھر ۱۴۰۸ھ میں حضرت مولانا لقمان الحق فاروقی نور اللہ مرقدہ کے وصال کے بعد تنہا حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی ہی اس مبارک سلسلہ کے تمام مراحل (ترتیب، تسوید، مراجعت، کتابت، تصحیح، طباعت اور اشاعت) کو انجام دینے لگی؛ لیکن دارالعلوم دیوبند کے تدریسی اور انتظامی امور میں بے پناہ مشغول رہنے کی وجہ سے اس کام میں قدرے سستی اور تاخیر ہوتی رہی، بالآخر حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں دارالعلوم دیوبند کے جواں سال فاضل، ذی استعداد عالم اور استاذ دارالعلوم دیوبند مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری مدظلہ کا تعاون حضرت الاستاذ کو اس عظیم اور مبارک سلسلہ کو

آگے بڑھانے کے لیے حاصل ہوا اور اس مبارک کام میں پیش رفت ہوئی۔ ترتیب وتسوید اور مراجعت کا کام مولانا فہیم الدین صاحب مدظلہ کرتے اور حضرت الاستاذ اس پر گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اصلاح کرتے تھے،اس طرح تقریباً دس عظیم جلدیں ایضاح البخاری کی مرتب ہوکر شائع ہوچکی ہیں۔

امید ہے کہ حضرت والا کے معاون اور شریک کار مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری اس سلسلہ کو مزید تیزی سے آگے بڑھا کر پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے،آج ایضاح البخاری حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہٗ کی حیاتِ جمیلہ کا امت مسلمہ کے لیے عظیم عطیہ اور لازوال کارنامہ ہے۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کارنامہ کو تاقیامت زندہ وتابندہ رکھے اور امتِ مسلمہ کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

اوصاف حمیدہ

آپ کا اہم وصف مردم سازی اور کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی تھا، کتنے ہی اہلِ علم کو آپ نے اپنے ساتھ کام میں لگا کر کامیاب مصنف بنادیا، زندگی کے آخری مراحل میں متعدد علماء واساتذہ دارالعلوم آپ کی نگرانی میں اہم تصنیفی اور تحقیقی کام میں مصروف تھے۔مولانا عارف جمیل صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند کو ''کشاف اصطلاحات الفنون'' کی تحقیق وتعلیق میں مصروف کردیا تھا۔مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری ''ایضاح البخاری'' کی ترتیب میں معاون اور شریک کار تھے۔مولانا اشتیاق احمد صاحب قاسمی ادبی کاموں میں آپ کے معاون رہتے تھے؛ چنانچہ ''کلیات کاشف'' ماضی قریب میں مولانا اشتیاق احمد قاسمی دربھنگوی کی تحقیق وتعلیق کے بعد حضرت والا نے شائع فرمائی جو حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی صاحب تفسیر ''ہدایت القرآن'' کا منظوم کلام ہے۔اس کے علاوہ بھی متعدد علماء کرام کو مختلف کاموں میں لگا رکھا تھا کوئی عالم یا مدرس دیوبند سے باہر کے آتے اور اپنا کوئی کام پیش کرتے تو اس کو دیکھ کر انتہائی مسرت کا اظہار کرتے تھے،اصلاح طلب امور کی جانب متوجہ فرماتے اور وقیع کلمات میں تقریظ لکھ کو حوصلہ افزائی فرماتے اور حوصلہ افزا دعاؤں کے ساتھ رخصت فرماتے تھے جس سے آنے والا شاداں وفرحاں واپس لوٹتا جس کا مشاہدہ کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں آج بھی موجود ہیں۔عصر کے بعد آپ کی مجلس ہوتی جس میں اساتذۂ دارالعلوم کے علاوہ دیگر مدارس کے علماء کرام دیوبند سے باہر کے مہمان اہلِ علم، طلبۂ عزیز اور ذمہ دارانِ مدارس شرکت فرماتے اور پیچیدہ مسائل،علمی اشکالات اس مجلس میں رکھے جاتے۔حاضرین مجلس اس پر سنجیدہ تبصرہ فرماتے اور پھر اس کا حل فرماتے اور سبھی حاضرین کی حضرت والا کی جانب سے چائے کی ضیافت بلاناغہ جاری رہتی اور ضیافت کو اپنے لیے سعادت عظمیٰ سمجھتے تھے۔کتنے ہی غریبوں،یتیموں، بیواؤں

کا ماہانہ آپ کے یہاں بندھا ہوا تھا جو پابندی کے ساتھ پہنچتا تھا اور اس میں کبھی تخلف نہ ہوتا تھا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ عید اور دوسرے خوشیوں کے مواقع پر اپنی اولاد کو کپڑے نہ بنائے اور ان کو سمجھا دیا؛ مگر غربا کی امداد واعانت میں ناغہ نہ ہوا۔ ع

خدا بخشے بڑی ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

راقم السطور سے حد درجہ محبت فرماتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں بندہ کو مضمون نویسی کی جانب متوجہ فرمایا۔ آج جو بھی لکھنے لکھانے کا معمولی شوق ہے یہ حضرت ہی کا مرہون منت ہے۔ طالب علمی کے دور میں بندے نے تقلید کے موضوع پر ایک مضمون بغرض اصلاح لکھ کر دکھایا۔ حضرت والا نے بہت زیادہ حوصلہ افزائی فرمائی اور فوراً ہی حضرت مولانا کفیل احمد صاحب علویؒ کو آئینہ دارالعلوم میں اشاعت کے لیے دینے کا حکم فرمایا اور اس پر سفارشی کلمات بھی تحریر فرمادیے۔ عالمی اجلاس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم کے موقع پر بندہ کو مقالہ لکھنے کا حکم فرمایا پھر متعدد مراحل میں اس کی اصلاح فرمائی اور طلبہ کی نشست میں اس کو پڑھنے کے لیے منظور فرمایا۔ ہر موقع پر اپنی یا اپنے مکتبہ کی مطبوعہ کتاب ضرور پیش فرماتے تھے اور دیوبند پہنچنے پر ناشتہ یا کھانے کے لیے ضرور مدعو فرماتے۔ نیز آزمائشی حالات آنے پر مکمل رہنمائی فرماتے اور ضروری مشوروں سے نوازتے تھے۔ ۲۲/شعبان ۱۴۰۶ھ کو بندہ کی دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے دو روز بعد میرے والد محترم کا انتقال ہوگیا۔ بندہ نے حضرت والا کو خط لکھا اور ایصالِ ثواب ودعا مغفرت کی درخواست کی۔ اس کے بعد شوال ۱۴۰۶ھ میں دارالافتاء میں داخلہ کی غرض سے دارالعلوم دیوبند حاضری ہوئی تو ملاقات کے بعد بہت زیادہ شفقت کا معاملہ فرمایا اور مزید ارشاد فرمایا کہ تم اپنے والد کے انتقال کا زیادہ احساس نہ کرنا؛ کیوں کہ دنیا سے ہر ایک کو جانا ہے اور ہم کو اپنا والد ہی تصور کرتے رہنا اور جو ضرورت ہو اس کو بلا تکلف بتلانا۔ اس کو پورا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی جائے گی۔ اس کے بعد سے برابر تاحیات حضرت والا کی شفقت پدری اس ناچیز کو حاصل رہی۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

امراض، وفات، نمازِ جنازہ اور تدفین

حضرت والا کچھ عرصہ سے مختلف امراض میں مبتلا تھے۔ ممبئی میں آنکھ کا آپریشن بھی ہوا۔ دل کا عارضہ بھی لاحق تھا، شوگر بھی کم وبیش ہوتی رہتی تھی، اس کے علاوہ بھی متعدد امراض لاحق تھے۔ علاج بھی برابر جاری رہتا تھا اور علاج کے ساتھ ساتھ تمام معمولات درس وتدریس، تصنیف وتالیف، عصر کے بعد کی مجلس، مہمانوں سے ملاقات، واردین وصادرین کے مسائل کو سننا اور ان کو حل کرنا، بدستور جاری تھے، گذشتہ شوال میں زیادہ بیمار ہوئے، عیدالاضحیٰ تک درس میں حاضری بھی برائے نام رہی؛ لیکن محرم

الحرام سے درس حدیث اور دوسرے اسباق حسب معمول جاری رہے اور مقررہ نصاب ماہ رجب تک مکمل کرایا۔ سالانہ امتحانات کے موقع پر تمام ایام میں حاضری ہوتی رہی؛ مگر وقت موعود آچکا تھا۔ بالآخر سالانہ امتحانات کی تعطیل میں جمعہ کا دن گزار کر ہفتہ کی رات میں تہجد کی نماز سے فراغت کے بعد صبحِ صادق کے وقت تقریباً چار بجے مؤرخہ ۲۳ر شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰ر مئی ۲۰۱۷ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اپنے مولائے حقیقی سے جاملے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ کئی روز سے حضرت والا کی برابر یاد آرہی تھی۔ فون کرنا چاہتا تھا؛ مگر نہ کرسکا۔ ہفتہ کی صبح دیوبند حاضر ہوکر ملاقات کا ارادہ تھا، صبح کو فون کے ذریعہ معلوم ہوا کہ حضرت دارالبقاء کی جانب رحلت فرماگئے۔ اب ملاقات ممکن نہیں ہے، صرف جسدِ خاکی کی زیارت ہی ہوسکے گی۔ جنازہ میں شرکت کا نظام بنایا اور جامع مسجد امروہہ کے اساتذۂ کرام کے ساتھ دیوبند حاضری ہوئی۔ جسد خاکی کی زیارت کی اور تقریباً ۳۵ر سال کی یادیں دماغ میں گھومنے لگیں۔ بعد نماز ظہر حضرت الاستاذ امیر الہند مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند کی امامت میں نمازِ جنازہ ہوئی اور ''قبرستانِ قاسمی'' میں تدفین عمل میں آئی، اس کے بعد غم ناک آنکھوں، غم زدہ دل کے ساتھ امروہہ واپسی ہوئی۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

اولاد واحفاد اور پس ماندگان

حضرت والا کی اہلیہ محترمہ (امی جان) کا چند سال قبل مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا تھا۔ اولاد میں تین صاحب زادگان: مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی، مولانا قاری محمد عدنان صاحب قاسمی، مولانا مفتی محمد سعدان صاحب قاسمی ہیں۔ اوّل الذکر کاروبار کرتے ہیں، ثانی الذکر امریکہ میں رہتے ہیں، موصوف نے اپنے والد کی بہت زیادہ خدمت کی ہے۔ ثالث الذکر معہد الانور میں مدرس ہیں اور دورۂ حدیث تک کی کتابیں پڑھاتے ہیں اور ماشاء اللہ تمام ہی فرزندان نیک صالح، خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔ پوری زندگی اپنے والد مرحوم کی اطاعت فرماں برداری میں گزاری۔ اس کے علاوہ آپ کے متعلقین، رشتہ دار، اعزہ، اقرباء، تلامذہ بھی آپ کے پس ماندگان میں شامل ہیں۔ خاص طور سے برادر محترم مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند ان کے فرزندانِ اور اہل خانہ بھی آپ کے پس ماندگان میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام ہی پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور حضرت والا کو اعلیٰ علیین میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ قبر مبارک کو نور سے منور فرمائے اور مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔ (آمین)

❁ ❁ ❁

حج اور اتحادِ امت

از: مولانا محمد اسرار الحق قاسمی

اسلام میں اجتماعیت پر بڑا زور دیا گیا ہے، اس سلسلے میں قرآن کریم کی واضح آیات بھی موجود ہیں اور روشن احادیث بھی، اسی طرح مسلمانوں کے درمیان اجتماعیت قائم کرنے کے لیے عملی نظام بھی موجود ہے۔ قرآن میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا المؤمِنُونَ اِخوَۃ'' (تمام مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں۔)

اللہ رب العزت اجتماعیت کی مدد فرماتے ہیں۔ ''یَدُ اللّٰہِ عَلَی الجماعَۃِ''۔ اسلام میں بہت سی عبادتوں کو ایک ساتھ ادا کرنے کا حکم کیا گیا ہے؛ تاکہ مسلمانوں کے درمیان اجتماعیت واخوت قائم رہے۔ اس پر سوال ہوتا ہے کہ اسلام میں اجتماعیت پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے؟ کیوں مسلمانوں کو اپنی صفوں میں اتحاد قائم کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے؟ دراصل اتحاد واجتماعیت کسی بھی قوم کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ قومیں باہم جس قدر متحد اور مجتمع ہوتی ہیں، اُسی قدر وہ با اثر اور ناقابلِ تسخیر خیال کی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جو اقوام وملل باہم اختلافات کی شکار ہوجاتی ہیں، ان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے، ان کے لیے اپنی شناخت وتشخص کو بچا پانا مشکل ہوجاتا ہے۔ کوئی قوم افراد کے اعتبار سے خواہ چھوٹی ہو؛ لیکن اگر وہ متحد ہے تو اس کے مستقبل کے تابناک ہونے کے امکانات روشن رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی روشن مثالیں موجود ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی تعداد بڑی قلیل تھی؛ لیکن وہ باہم متحد تھے، تو اس چھوٹی سی تعداد نے بڑے بڑے معرکوں کو سر کیا۔ تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ خلفائے راشدین کے دور میں اسلام دنیا کے دور دراز کے علاقوں وملکوں میں پہنچ گیا، مختلف ممالک ایک کے بعد ایک مسلمانوں کے زیرِ نگیں آتے چلے گئے اور دنیا کی بڑی بڑی قومیں مسلمانوں کے سامنے بکھر کر رہ گئیں؛ لیکن جب مسلمانوں میں اخوت و بھائی چارگی نہ رہی، وہ باہم لڑنے لگے، اپنے اپنے مفادات کے لیے اپنے ہی بھائیوں پر حملہ آور ہونے لگے تو دنیا سے مسلمانوں کا دبدبہ ختم ہوگیا اور چھوٹی چھوٹی قومیں بھی انھیں لقمۂ تر سمجھنے لگیں۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس پچاس سے زیادہ ممالک ومملکتیں ہیں۔ دنیا میں ان کی تعداد سوا ارب سے بھی زائد ہے، مسلمانوں کے متعدد ممالک میں پٹرول، ڈیزل، تیل وگیس کے ذخائر موجود ہیں اور ان کے پاس پُرتعیش زندگی گزارنے کے لیے وافر مقدار میں وسائل وذرائع ہیں؛ مگر اس کے باوجود دنیا کے منظرنامے پر ان کا کوئی اثر ورسوخ نہیں ہے، نہ صرف دنیا کی بڑی قومیں؛ بلکہ چھوٹی چھوٹی قومیں بھی ان کا محاصرہ کرنے پر کمربستہ نظر آتی ہیں اور اُن پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوششیں کرتی ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کوٹھیس پہنچانے کے لیے آئے دن اسلام پر بے ہودہ الزامات لگائے جاتے ہیں اور کبھی قرآن کو تو کبھی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے؛ تاکہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچے، وہ مشتعل ہوں اور پھر ان کو جانی ومالی نقصان سے دوچار کیا جائے مسلمانوں کی یہ دُرگت اس لیے ہوئی کہ وہ باہم متحد نہیں ہیں، چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بنٹ گئے ہیں۔ کہیں برادریوں کے نام پر ان کے درمیان فاصلے قائم ہیں، کہیں مسلک کے نام پر ان کے مابین دوریاں پائی جاتی ہیں اور کہیں علاقائیت کے نام پر باہم دست وگریباں ہیں۔ اس فرقہ بندی نے مسلمانوں کے شیرازے کو بری طرح متاثر کیا ہے۔

یہ زمانہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا ہے۔ ہر قوم دنیا پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے، اسی لیے آگے بڑھنے اور دوسری قوموں کو پیچھے چھوڑنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے اختیار کیے جارہے ہیں، وہ قومیں جو صدیوں سے منتشر چلی آرہی تھیں، وہ اب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر اپنی طاقت میں اضافہ کررہی ہیں؛ مگر مسلمان ہنوز منتشر ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے اس کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں
منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

صدیوں سے مسلمانوں کے درمیان جاری اختلافات کے خطرناک نتائج نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جب تک مسلمان اپنی صفوں میں اتحاد واجتماعیت قائم نہیں کریں گے، رُسوائی اور پسماندگی کی بیڑیاں ان کے پیروں میں پڑی رہیں گی؛ حالانکہ برسہابرس سے جاری مسلمانوں کے درمیان قائم اختلافات کا ختم ہونا بہ ظاہر آسان نظر نہیں آتا اور اس سلسلے میں کی جانے والی تدبیروں کے کارگر ہونے کے مضبوط امکانات بھی دکھائی نہیں دیتے؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے آپ کو اسلام کا پابند بنالیں اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں، نیز اسلامی نظام کو اپنے درمیان اخلاص وجذبات کے ساتھ قائم کریں تو مضبوط اتحاد اور یگانگت ان کے مابین آسانی کے ساتھ قائم ہوجائے گی۔

اسلام میں عبادات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے چار کا تعلق براہِ راست عبادت سے ہے۔ قرآن میں انسان کی پیدائش کا مقصد بھی عبادتِ الٰہی بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا: وَمَاخلقتُ الجنَّ وَالانسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْن۔ اگر مسلمان خلوصِ نیت کے ساتھ عبادت کریں اور عبادت کے تقاضوں ومطالبوں کو پورا کریں تو ان کے درمیان اجتماعیت قائم ہوجائے گی۔ مثال کے طور پر پانچ وقت کی نمازیں مسلمانوں پر فرض کی گئی ہیں؛ لیکن ان نمازوں کو اجتماعیت کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ دن رات میں پانچ بار ایک ہی وقت میں مسجد میں جمع ہونا، پھر ایک ہی ساتھ کاندھے سے کاندھا ملانا، ایک ہی ساتھ رکوع وسجود کرنا، اٹھنا اور بیٹھنا آپسی بھائی چارے کے لیے بڑا موٴثر ہے۔ محلّہ کی سطح پر اتحاد کے قیام کے بعد اس کے دائرے کو مزید اس طرح پھیلایا گیا ہے کہ ہفتے میں ایک بار جمعہ کی نماز فرض کی گئی ہے اور اس نماز کو شہر کی جامع مسجد میں ادا کرنا زیادہ بہتر قرار دیا گیا۔ شہر کی جامع مسجد کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے؛ تاکہ پورے شہر کے لوگ کم از کم ہفتے میں ایک بار جامع مسجد میں جمع ہوجایا کریں اور ایک ساتھ بارگاہِ الٰہی میں سر بہ سجود ہوجایا کریں، یقیناً یہ عمل بھی مسلمانوں کے درمیان اتحاد کے قیام کے لیے بڑا موٴثر ہے۔ سال میں دو مرتبہ عیدین کے مواقع پر دوگانہ نماز کی ادائیگی کے لیے عیدگاہ کا انتخاب اس لیے بھی بہترین ہے کہ وہاں نہ صرف ایک قصبے یا شہر کے لوگ جمع ہوں؛ بلکہ قرب وجوار کی بستیوں وگاؤوں کے مسلمان بھی اکٹھے ہوں، ایک ساتھ اللہ سامنے کھڑے ہوں، آپس میں کاندھے سے کاندھا ملائیں۔ اس موقع پر ایک دوسرے کو مبارکباد بھی پیش کریں اور ایک دوسرے کے احوال سے بھی واقف ہوں۔

عالمی سطح پر مسلمانوں کے درمیان اتحاد واجتماعیت قائم کرنے کے لیے باری تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے ایک بڑے اور بین الاقوامی اجتماع کا موقع حج کی شکل میں عنایت فرمایا۔ صاحبِ

استطاعت افراد کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے ملکوں وخطوں سے سفر کریں، بیت اللہ میں جمع ہوں جو امن وسلامتی کا مرکز ہے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حج کے ایام میں ہر خطے اور ہر ملک کے مسلمان بیت اللہ شریف میں مجتمع ہوتے ہیں اور مخصوص دنوں میں طواف کرتے ہیں، ارکانِ حج ادا کرتے ہیں، منیٰ میں جاتے ہیں، کوہِ صفا اور مروا پر دوڑ لگاتے ہیں۔ اسی اثنا میں انھیں ایک دوسرے کے ساتھ گفت وشنید اور باہم متعارف ہونے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ان کے لیے اس بات کا موقع ہوتا ہے کہ وہ اپنے علاقوں کے حالات و واقعات ایک دوسرے کو بتاسکیں، ایک دوسرے کے مشورے حاصل کرسکیں۔ ساتھ ہی اس عظیم اجتماع سے یہ پیغام بھی ملتا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان اللہ کے دربار میں برابر ہیں۔ وہاں نہ کوئی چھوٹا ہے، نہ بڑا؛ سب کو ایک ہی جیسے اعمال کرنے ہیں سب کو **لَبَّیكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْك** کی صدائیں بلند کرنی ہیں، سب کو احرام باندھنا ہے ؂

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا ، نہ کوئی بندہ نواز

حج اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمان پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کے آگے اپنے آپ کو جھکادیں اور پورے طور پر اللہ کی اطاعت کریں۔ حج اس بات کا بھی تقاضہ کرتا ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو کمتر یا حقیر نہ سمجھے۔ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ وہ بڑا ہے یا امیر ہے، عہدیدار ہے یا شہرت یافتہ ہے اور دوسرا چھوٹا ہے یا غریب ہے یا عام آدمی ہے۔ جب انسان اپنے ذہن کو پاک صاف کرلے گا اور اپنی بڑائی کے خیال کو قلب سے نکال پھینکے گا تو مسلمان ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔ اتحاد واجتماعیت کا جو ثبوت حجاجِ کرام حج کے موقع پر دیتے ہیں، وہی ثبوت اگر وہ اپنے اپنے علاقوں میں جاکر دیں تو مثبت اثرات ظاہر ہوں گے، اسی طرح جو باتیں وہ دورانِ حج سیکھتے ہیں ، اگر اپنے اپنے خطوں وسوسائٹیوں میں جاکر دوسرے مسلمانوں کو بھی سکھائیں تو حج کی افادیت کا دائرہ پوری دنیا کے مسلمانوں پر پھیل جائے گا۔ افسوس! مسلمان حج کے ماحول کو اپنے وطن واپس لوٹ کر قائم نہیں رکھ پاتے اور اس پیغام کو عام نہیں کرپاتے جو انھیں دورانِ حج حاصل ہوتا ہے۔ حج کرنے والے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حج کرنے کے بعد حاجی ایسا ہوجاتا ہے جیسے وہ اپنی ماں کے پیٹ سے ابھی پیدا ہوا ہے، یعنی اس کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں اور وہ پاک صاف مسلمان بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کا جو بندہ اس مقام پر فائز ہوجائے، اس کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ عوام الناس کے درمیان ایک پکا سچا مسلمان ہونے کا ثبوت بھی دے؛ تاکہ دوسرے

مسلمانوں کے لیے بھی اس کی شخصیت مفید و موٴثر ثابت ہو، مسلمانوں کی اکثر سوسائٹیوں میں ان لوگوں کی اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے جو حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ اگر تمام حجاج کرام لوگوں کے سامنے اسلام کی باتیں کریں گے اور جو تربیت انھوں نے حج کے دوران حاصل کی ہے، اُسے لوگوں میں تقسیم کریں گے تو سماج اور افراد کی اصلاح کا موثر سامان فراہم ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر وہ اپنے اپنے علاقے کے مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دیں گے اور اسے اپنا مشن بنائیں گے تو اس کے مثبت اور بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ کاش! حجاجِ کرام حج کے اس پیغام کو سمجھیں، اسے عام کرنے پر کمر بستہ ہوں اور اپنی کوششوں کو وقت کی ضرورت کے مطابق مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اجتماعیت قائم کر کے انھیں بحیثیت ایک امت و ملت تقویت پہنچانے کا کام کریں۔

حج بیت اللہ کے موقع پر مسلمانوں کے درمیان عالمی اتحاد بھی ممکن ہے؛ اس لیے کہ ساری دنیا کے مسلمان وہاں جمع ہوتے ہیں، پھر ہر مسلمان بیت اللہ کا احترام بھی کرتا ہے۔ وہاں اگر وسیع پیمانہ پر اتحاد و اجتماعیت کی بات کی جائے تو موثر ثابت ہوگی۔ اس وقت عالمی اتحاد کی ضرورت بھی ہے؛ کیونکہ مسلم ممالک کے مابین جس طرح کا اتحاد ہونا چاہیے، وہ نظر نہیں آتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ تنظیمیں اس طرح کی موجود ہیں جن سے بہ ظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلم ملکوں میں اتحاد ہے؛ لیکن جب اس اتحاد کی عملی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو یہ ممالک اپنی اپنی رائے کے ساتھ الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ اگر کسی مسلم ملک میں حالات خراب ہیں تو یہ اس کا تعاون بھی کرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ ایسے ہی کسی ملک میں مسلمانوں کو ستایا اور دبایا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ظلم و ناانصافی ہوتی ہے تب بھی وہ ہونٹوں سلے رہتے ہیں؛ حالاں کہ بحیثیت مسلم سارے مسلمانوں اور مسلم ملکوں کو دوسرے مقامات کے مسلمانوں کی بھی فکر ہونی چاہیے۔ اتحاد اور باہمی روابط نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے مالدار ممالک ان مسلم ملکوں کا تعاون بھی نہیں کر پاتے، جہاں غربت پائی جاتی ہے اور جہاں کے لوگ بڑی مفلوک الحالی میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں؛ جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ ایسے غریب ممالک اور مسلمانوں کی مالی امداد کی جانی چاہیے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کے مابین اتحاد و اتفاق کی کوئی کوشش موثر ثابت نہ ہوئی تو آنے والے وقت میں مسلمان اور پیچھے ہو جائیں گے اور طرح طرح کے مسائل میں مزید گھر جائیں گے۔ حج بیت اللہ کے پیغام سے تمام عالم کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔

❁ ❁ ❁

مسائل وفتاویٰ

سوال: (۱) محرم کی دس تاریخ کی تخصیص کے ساتھ دسترخوان وسیع کرنا یعنی غرباء ومساکین یا اعزاء و اقارب کو کھانا کھلانا؛ جب کہ اس امر کے کرنے میں کسی خلافِ شرع عمل کا دخل نہ ہو اور نیت صرف اللہ کی رضا اور حصولِ ثواب ہو، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

(۲) کیا خاص طور پہ محرم کی دسویں تاریخ کو دسترخوان وسیع کرنے کی کوئی فضیلت وارد ہوئی ہے؟

الجواب: باسمہٖ تعالیٰ، الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ:

(۱) دسویں محرم کو ثواب کی نیت سے غریبوں ومساکین کو یا اعزہ واقربا کو کھانا کھلانے کی کوئی فضیلت وارد نہیں ہوئی؛ ہاں وسعتِ رزق کی امید سے اپنے اہلِ وعیال کے لیے دسترخوان وسیع کرنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے؛ اس لیے اگر کوئی شخص وسعت رزق کی امید سے اپنے اہل وعیال کے لیے محرم کی دسویں تاریخ کو دسترخوان وسیع کرتا ہے تو یہ جائز؛ بلکہ مستحسن ومندوب ہے۔

(۲) جی ہاں! بیہقی کے ''شعب الایمان'' (رقم: ۳۵۱۵) میں، طبرانی کے ''المعجم الکبیر'' (رقم ۱۰۰۰۷) میں ان الفاظ کے ساتھ محرم کی دسویں تاریخ کو دسترخوان وسیع کرنے کی فضیلت کے سلسلے میں حدیث وارد ہوئی ہے: **من وسع علی عیاله یوم عاشوراء وسع اللّٰه علیه في سائر سنته (شعب) لم یزل في سعة سائر سنته.** جو شخص عاشوراء کے دن اہل وعیال کے لیے وسعت اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ پورے سال اس کے لیے وسعت کرے گا۔ یہ حدیث فضائل کے باب میں قابلِ عمل ہے، متعدد محدثین اور شراحِ حدیث نے اس کی تصریح کی ہے۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ ''**المقاصد الحسنه**'' میں لکھتے ہیں: حدیث **مَنْ وَسَّعَ عَلَی عِیَالِهِ فِی یَوْمِ عَاشُورَاءَ وَسَّعَ اللَّه عَلَیْهِ السَّنَةَ کُلَّهَا، الطبرانی فی الشعب وفضائل الأوقات، وأبو الشیخ عن ابن مسعود، والأولان فقط عن أبی سعید، والثانی فقط فی الشعب عن جابر وأبی هریرة، وقال: إن أسانیده کلها ضعیفة، ولکن إذا ضم بعضها إلی بعض أفاد قوة، بل قال العراقی فی أمالیه: لحدیث أبی هریرة طرق، صحح بعضَها ابن ناصر الحافظ، وأورده ابن الجوزی فی الموضوعات من طریق سلیمان ابن أبی عبد اللّٰه عنه، وقال: سلیمان مجهول، وسلیمان**

ذكره ابن حبان فى الثقات، فالحديث حسن على رأيه، قال: وله طريق عن جابر على شرط مسلم، أخرجها ابن عبد البر من رواية الزبير عنه، وهى أصح طرقه، ورواه هو والدارقطنى فى الأفراد بسند جيد، عن عمر موقوفا والبيهقى فى الشعب من جهة محمد بن المنتشر، قال: كان يقال، فذكره، قال: وقد جمعت طرقه فى جزء، قلت: واستدرك عليه شيخنا –رحمه اللّٰه– كثيرا لم يذكره، وتعقب اعتماد ابن الجوزى فى الموضوعات قول العقيلى فى هيضم بن شداخ راوى حديث ابن مسعود: إنه مجهول بقوله: بل ذكره ابن حبان فى الثقات والضعفاء (المقاصد الحسنة: ٦٧٥/٤، ط: دار الكتاب العربي، ط: بيروت) اورحافظ بن حجر نے "الأمالي المطلقة" میں اس حدیث پر تفصیلی بحث کے ضمن میں فرمایا: وله شواهد عن جماعة من الصحابة... منهم عبد اللّٰه بن مسعود وعبد الله بن عمر وجابر وأبوهريرة وأشهرها عبد الله بن مسعود الخ (الأمالي المطلقة ۱۰/ ۲۸، ط: المكتب الإسلامي، بيروت) نیز دیکھیں: اليواقيت الغالية (۲۰۷/۱، ط: برطانیہ) وامدادالفتاوی (۲۸۹/۵، ط: زکریا) وفتاوی دارالعلوم (۵۳۹/۱۸) واحسن الفتاوی (۳۹۵/۱، ط: زکریا)

فقط واللّٰه تعالیٰ اعلم بالصواب

محمد اسداللہ غفرلہ، معین مفتی

الجواب صحیح: محمود حسن بلندشہری غفرلہ، محمد نعمان سیتاپوری غفرلہ
مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

سوال: محرم کے دسویں دن جو رسمیں ہوتی ہیں مثلاً شربت پلانا وغیرہ۔ اس کے متعلق علمائے دیوبند کیا فرماتے ہیں؟ سنی لوگ یہ کہتے ہیں کہ فتاوی رشیدیہ میں لکھا ہے کہ شربت پینا حرام ہے۔

بسم اللّٰه الرحمن الرحيم، حامدًا ومصليا ومسلّما، الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة

محرم کی دسویں تاریخ کو سبیل لگانا، شربت یا دودھ وغیرہ پلانا شیعہ اور روافض کے ساتھ تشبہ کی وجہ سے ناجائز ہے۔ فتاویٰ رشیدیہ میں بھی یہی بات لکھی ہے، اس کے الفاظ یہ ہے "محرم میں ذکر شہادت حسین علیہ السلام کرنا اگرچہ بروایاتِ صحیحہ ہو یا سبیل لگانا، شربت پلانا یا چندہ سبیل اور شربت میں دینا یا دودھ پلانا سب نادرست اور تشبہ روافض کی وجہ سے حرام ہیں"۔ (فتاویٰ رشیدیہ، ص: ۱۳۹) یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے، اگر آپ کو اس میں کوئی اشکال ہو تو تحریر کریں۔

محمد اسداللہ غفرلہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی، محمد نعمان سیتاپوری غفرلہ
مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند